
MAGAZINE
Graduate's
مجلّہ طیلسانین
22469

جلد دوم
۱۹۳۷ء

شمارہ دوم
۱۳۴۷ف

مجلہ طیلسانین

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ صدر
عبد المجید صدیقی ایم اے ال ال بی (عثمانیہ) پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ رکن
غلام دستگیر رشید ایم اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج 〃
مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی (عثمانیہ) شعبہ حیاتیات جامعہ عثمانیہ 〃
سید محمد ایم اے (عثمانیہ) لکچرار اردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج معتمد

ناشر

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ گھانسی بازار

حیدرآباد دکن

مجلہ طیلسانیین

۱۔ یہ مجلسِ علمیہ طیلسانیین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے، جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شایع ہوگا۔

۲۔ اس رسالے میں طیلسانیین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں، اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شایع ہوں گے جو جامعۂ عثمانیہ کی ایم اے اور ایم ایس سی کی ڈگریوں کیلیے قبول کیے گئے ہیں نیز انجمنِ طیلسانیین عثمانیہ کی علمی سرگرمیوں کی روداد بھی پیش کیجائیگی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیاتِ حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت سے قابلِ اشاعت متصور نہ ہونگی۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی خریدارانِ بلدہ سے اور خریدارانِ اضلاع سے ے ۱۲/ بشمول محصولِ ٹپہ۔

۶۔ زرِ چندہ اور تمام مضامین نظم و نثر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کے لیے منتظمِ اعزازی سے مراسلت کی جائے۔

مجلۂ طیلسانین

فہرست

اداریہ ۵
ذہنی تصوریت .... ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ۹
چکبست کی قومی شاعری .... سید مہدی حسین صاحب ۲۱
معاشی تقسیم عمل .... محمد عنایت حسن صاحب ۵۳
حیدرآباد دکن کی صبح .... سید سکندر علی صاحب وجد ۶۱
مسعود مرحوم، علامہ اقبال اور مجلۂ عثمانیہ .... عابدی صاحب ۶۳
سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات .... ظہیر الدین صاحب ۶۵
تنقید و تبصرہ .... محمد اکبر الدین صاحب صدیقی ۹۱

ششماہی رپورٹ انجمن طلبسائے عثمانیہ .... محمد غوث صاحب (معتمد) ۹۵
قواعد معاشی کمیٹی ۱۲۱
عثمانیین کی کتابیں ۱۲۵

اداریہ

"اس کی آرام گاہ شاہی مسجد کا دامن ہے ..... جہاں ہزاروں مسلمان روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں۔
شام کے وقت تو اتنا دردناک اور پُرسوز منظر رہتا ہے کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کی
آنکھوں سے بھی بے ساختہ آنسو ٹپک پڑتے ہیں —" (عبدالرحمٰن چغتائی)

یہ اس شاعرِ اعظم کی آخری آرام گاہ کا حال ہے جس نے اپنے اعلیٰ تخیلات اور بلند تفکرات کے ذریعے سے اسلامی دنیا میں حرکت و حیات کی لہر دوڑا دی تھی۔ اقبال کی شخصیت کے ساتھ ایک بڑا مفکر، فلسفی، مسلمانوں کا رہنما اور اردو کا محسن ہمیشہ کے لیے دفن ہوگیا اور اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ اس کا نعم البدل کب ملے گا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید | نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید کہ ناید (اقبال)

کوئی دوسرا "دانائے راز" پیدا ہو کہ نہ ہو — یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اقبال ہمارے لیے ایک جاودانی پیام چھوڑ گیا ہے جس کے پردے میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس جاودانی پیام کو اگر ہم اپنا رہنما بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اقبال کے نعم البدل کی تلاش میں رہیں۔

اقبال کا تصورِ قومیت، رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود سے بالاتر تھا اس لیے اس نے جو کچھ کہا وہ ساری دنیا کے لیے کہا۔ اگرچہ اس نے پہلے پہلے ہندوستان کو اپنا مخاطب بنایا۔ لیکن اس کے بعد اپنی قوم کی طرف توجہ کی اور آخر میں اس کا پیام ساری دنیائے انسانیت کے لیے ہوگیا۔

"جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ

قائل نہ ہو جائے گا جب تک جغرافیائی وطن و نسل اور رنگ کا امتیاز مٹ نہ جائے گا، انسان اس دنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ کبھی شرمندۂ معنے نہ ہوں گے۔" (اقبال)

حیدر آباد نے اس شاعر اعظم کا شایان شان خراج تحسین ادا کیا ابھی وہ زندہ ہی تھا کہ "مسلم کلچر سوسائٹی" کی جانب سے ہز ہائنس والا شان شہزادۂ برار کی صدارت میں شاندار طریقے سے "یوم اقبال" منایا گیا۔ اس کے بعد ماہ نامۂ "خلیق" نے "اقبال نمبر" شایع کیا اس کی وفات کے بعد حیدر آباد اور اس کے اضلاع میں تعزیتی جلسے ہوئے اور ماہ نامۂ "سب رس" نے "اقبال نمبر" شایع کیا۔ ہمیں توقع ہے کہ اقبال کے پیام و کلام کی عالمگیر اشاعت میں حیدر آباد ہمیشہ کی طرح امتیازی حصہ لے گا۔

دنیائے اردو ادب کے لیے مشہور مورخ اکبر شاہ خاں کی وفات بھی ایک افسوسناک سانحہ ہے ان کی تصنیفات نے تاریخی ادب میں خاص اہمیت حاصل کر لی ہے انتقال کے وقت تک "تاریخ اسلام" زیر ترتیب تھی ممکن ہے کہ اس کی اشاعت سے ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہو جائے۔ وہ مورخ کے علاوہ شاعر بھی تھے اور اردو اور فارسی میں بڑی اچھی غزلیں لکھتے تھے۔

گزشتہ مہینے عثمانیہ بلدی جماعت نے اپنی سالانہ کانفرنس منعقد کی اس جماعت کے کارنامے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ بلدیہ کی انتخابی سرگرمیوں، شہر کی آرائش و صفائی میں ارباب بلدیہ کی معاونت کے علاوہ اس نے حالیہ ہنگامے میں جس طرح اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کی ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔

اس کی دوسری سالانہ کانفرنس، پہلی کانفرنس سے زیادہ کامیاب رہی خطبۂ استقبالیہ، خطبۂ صدارت، مسز سروجنی نائیڈو، نواب مہدی نواز جنگ اور محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کی تقاریر اور اکثر تحریکات نے یہ ثابت کر دیا کہ شہریت کے ارتقا میں اس جماعت کا خاص حصہ ہے۔

اراکین بلدی جماعت نے صفائی کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ بادی النظر میں یہ ایک طفلانہ حرکت تھی لیکن اس کی تہ میں ایک احساس خدمت گزاری بھی پوشیدہ تھا اور ہمیں امید ہے کہ اس نمایش سے ہٹ کر ہماری بلدی جماعت عملاً اپنے جذبۂ خدمت گزاری کو کام میں لائے گی۔

ادارہ جامعہ کی پہلی میقات کا افتتاح کرتے ہوئے نواب معین امیر جامعہ نے ایک بلند پایہ تقریر فرمائی اور

ضبط" پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ آپ نے کہا کہ :-

"ہر شخص کو ضبط" کا پابند ہو جانا چاہیئے۔ کوئی سمجھدار شخص یہ نہیں چاہتا کہ وہ جس ادارے یا ریاست میں رہتا ہے اس کو نقصان پہنچائے۔ آزادی اشتراکِ عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

ضبط کی مشق پہلے اپنے آپ سے شروع ہونی چاہیئے نفس کی غلامی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی غلامی نہیں۔ جو شخص جامعہ اور ریاست کی بہتری و بہبودی چاہتا ہے وہ ضبط پیدا کرے۔ ضبط ہی آزادی کا مفہوم ہے۔"

ہمیں توقع ہے کہ برادرانِ جامعہ نواب صاحب کے ان قیمتی خیالات کو ہر قدم پر اپنا رہنما بنائیں گے اس سلسلے میں نواب صاحب نے طلباء کی ضبط شکنی کا بھی صحیح اندازہ لگایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :-

"استاد کا فرض ہے کہ وہ طالب علموں کے مزاج و خیالات سے واقف ہو کر ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لے۔ ان کی نفسیات معلوم کرے۔ طالب علم کوئی لکڑی نہیں ہے جس کو جس طرح جی چاہتا ہے کاٹے اور چھیلے استاد جس قدر طالب علموں کے مزاج اور طبیعت سے واقف ہو گا اسی قدر وہ طلبہ میں ضبط پائے گا۔ کوئی استاد جب طلباء کے احساسات کو نظر انداز کر دیتا ہے تو طلباء اس سے سرکش اور باغی ہو جاتے ہیں اور ان کی ہمت اور حوصلوں میں پستی آجاتی ہے۔ طالب علم فی الحقیقت سرکش اور باغی نہیں ہوتا لیکن استاد کی غلط رہنمائی اس کو ایسا بنا دیتی ہے۔"

جب تک اساتذہ اور طلباء قریب تر نہیں ہوتے، وہ خلیج جو ان کے خوش گوار تعلقات میں حائل رہتی ہے کبھی پاٹی نہیں جا سکتی۔

مجلۂ عثمانیہ کی تازہ اشاعت کو دیکھ کر تمام عثمانیین کی طرح ہمیں بھی افسوس ہوا۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ادارت کے لیے غلط طریقۂ انتخاب اس قسم کی لغزشوں کا ذمہ دار ہے۔ انجمن اتحاد جامعۂ عثمانیہ کے انتخابات جامعی احساس کے تحت عمل میں آتے ہیں اور وعدہ پر انتخابی کام کا دار و مدار ہوتا ہے انتخاب کے بعد ان تمام عہدوں پر جن کے انتخابات کابینۂ انجمن اتحاد کے اختیار میں ہیں وہی اشخاص منتخب کیے جاتے ہیں جن سے وعدہ کر کے انتخابی مہم میں کام لیا گیا تھا۔ ہم جامعی احساس کو اس حد تک برا نہیں سمجھتے کہ وہ جامعاتی کاروبار پر اثر انداز ہوئے بغیر کام آسکے۔ لیکن جہاں محض جماعت بندی کے غلط تصور سے جامعہ کی روایات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ہم کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔

ہم "مجلۂ عثمانیہ" کی اس معیاری بلندی کے پیشِ نظر جو اربابِ ذوق میں احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے جامعہ کی انجمنِ اتحاد کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مدیروں کے انتخاب میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ مجلہ کی

مجلسِ نگرانی ہی جامعہ کے اچھے طالب علموں میں سے مجلہ کے لیے مدیر منتخب کرے۔ بہرحال جو طریقہ بھی ہو، یہ ضروری ہے کہ وہ مجلہ کی ترقی کے رستے میں حائل نہ ہو۔

جامعۂ عثمانیہ نے گذشتہ سال طالبات کے لیے ام۔اے اور ام۔ایس۔سی کی جماعتیں کھول دی تھیں اور ان جماعتوں کی تمام طالبات نے کامیابی حاصل کی۔ ہم نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ طالبات جامعہ، طلبائے جامعہ سے کسی طرح کم نہ نہیں ہیں۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں سے اردو دنیا ناواقف نہیں ہے۔ ان میں زورِ قلم بھی ہے، بلندیٔ فکر بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔ ہم تمام طالبات کو ان کی نمایاں کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں خصوصاً محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ کو جنھوں نے امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی ہماری جامعہ کے فاضل طیلسانی ہیں۔ ان کو طالب علمی ہی کے زمانے سے علمی خدمت کا بے پایاں شوق رہا ہے چنانچہ وہ ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ ان کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ان کی سائنسی تحقیق عام طور پر قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ حال ہی میں بہترین سائنسی تحقیق پر ان کی خدمت میں الہ آباد سائنس اکاڈمی کی جانب سے ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ امتیاز ہے جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے، اس لیے اس پر جامعہ جس قدر ناز کرے کم ہے۔

اس سال حیدرآباد سیول سروس کلاس کا انتخابی نتیجہ اگرچہ عثمانیین کے لیے ناسازگار رہا لیکن ایک ممتاز طیلسانی مرزا عبدالباسط بیگ صاحب اس سال کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔ ہم ان کو علمی زندگی کے دائرے میں داخل ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جامعہ میں سیول سروس کلاس کے لیے طلبا کو تیار کرنے کے لیے خاص انتظام ہونے کے باوجود اس سال ایسا نتیجہ کیوں نکلا؟ اس کو محض اتفاقی تصور کرلیں تو ہم آیندہ سال بہتر نتیجے کی توقع کرتے ہیں۔

۹

ذہنی تصوّریت

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جان بارکلے (۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء) اٹھارہویں صدی کا ایک نہایت تیز فہم آئرش فلسفی گزرا ہے جس نے تصوّریت کی ایک موضوعی یا ذہنی صورت پیش کی ہے، اور وجودِ ذہن کو فلاطون سے زیادہ اساسی شئے قرار دیتا ہے، کیوں کہ بارکلے مادّے کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ فلاطون نے کہا تھا کہ مادّے کا وجود پایا جاتا ہے لیکن وہ مادّے کو کوئی اہم شئے قرار نہیں دیتا، بارکلے کہتا ہے کہ سرے سے مادّے کا وجود ہی نہیں پایا جاتا۔ کائنات بالکل غیر مادّی، روحانی شئے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے۔ جو چیزیں مادّی اشیاء کہلاتی ہیں وہ ذہن کے محض تصوّرات ہیں۔ اشیاء کا وجود ذہن کا محتاج ہے۔ اس معنے کر کے وجودِ اشیاء محسوسیت اشیاء کے مرادف ہے۔

جو شئے قطعاً کسی نفسِ مدرکہ کے حسّ و ادراک میں نہیں آتی وہ

موجود ہی نہیں ہو سکتی۔ بارکلے کے اس نظریے کو منظارم یا ذہنی تصوریت یا روحانی کثرتیت کہا جاتا ہے۔ بارکلے نے اس کو ۱۷۱۰ء میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مبادی علم انسانی"

Treatise Concerning the Principles Of Human Knowledge

میں پیش کیا اور ۱۷۱۳ء میں وہ اپنی دوسری کتاب "مکالمات ابین ہائیلس و فلونیس" میں اس نظریے کے اساس پر خدا کے وجود کا ایک نیا ثبوت پیش کرتا ہے۔[1] یہ دونوں کتابیں نسبتاً آسان اور دلچسپ زبان میں لکھی گئی ہیں، طلباء کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

بارکلے کا یہ دعویٰ کہ مادی اشیاء کا سرے سے وجود ہی نہیں پایا جاتا ہمیں ایک آشفتہ دماغ فلسفی کی یاوہ گوئی نظر آتا ہے اور جب ڈاکٹر جانسن نے اپنے کسی ملاقاتی سے بارکلے کے اس دعوے کو سنا تو اس نے پتھر پر زور سے ایک ٹھوکر لگائی اور کہا کہ میں بارکلے کے ہذیان کی اس طرح تردید کرتا ہوں! بھلا جس چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے، کانوں سے سنتے، ہاتھوں سے چھوتے اور زبان سے چکھتے ہیں، اس کا انکار کس طرح ممکن ہے، فلسفے کی بھول بھلیاں ہمیں عام و معمولی زندگی کی ان ٹھوس چیزوں کی طرف سے کب اندھا کر سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بارکلے بھی کبھی ایک لحظہ کے لیے ان براہ راست محسوس ہونے والی اشیاء کے وجود کا انکار نہیں کرتا۔ وہ آپ کی میری طرح مانتا ہے کہ یہ شجر و حجر، یہ میز کرسی جن کا ہم ادراک کر رہے ہیں حقیقی وجود رکھتی ہیں، لیکن وہ اس امر سے ضرور انکار کرتا ہے کہ ان کا وجود ذہن سے باہر ہے! بالفاظ مختصر وہ اس امر سے انکار کرتا ہے کہ جو اشیاء براہ راست محسوس ہوتی ہیں ایسے حقایق ہیں جن کا وجود اس حالت میں بھی باقی رہتا ہے جب کہ کسی نفس کو ان کا شعور نہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ایجابی طور پر بارکلے کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء تصورات ہیں، بقول شوپنہور کے "دنیا میرا تصور ہے"۔

---

[1] یہ دونوں کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں، اول الذکر کتاب کا مولوی عبدالباری صاحب ندوی اور ثانی الذکر کا مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے نہایت خوبی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب نے برکلے کے نام سے ایک کتاب شایع کی ہے جو اس فلسفی کے سوانح و فلسفہ پر ایک مستقل تالیف ہے۔ کتاب مختصر ہے لیکن طلباء کے لیے نہایت مفید ہے۔

ع "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"! بر کلے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:۔

"جس میز پر میں لکھ رہا ہوں وجود رکھتی ہے، یعنی اس کو میں دیکھتا ہوں اور چھوتا ہوں؛ اگر میں اپنے کمرے سے اُٹھ کر چلا جاؤں تو بھی میں یہ کہوں گا کہ میز موجود ہے، جس سے میری مُراد یہ ہوگی کہ اگر میں اپنے کمرے میں ہوتا تو اس کو دیکھ سکتا یا کوئی اور روح فی الحقیقت اس کو دیکھ رہی ہے۔ (اسی طرح کہا جاسکتا ہے کہ) بُو کا وجود تھا یعنے وہ سُونگھی گئی تھی، آواز کا وجود تھا، یعنے وہ سُنی گئی تھی، رنگ یا شکل کا وجود تھا، یعنے بصر و لمس سے اس کا ادراک یا احساس ہوا تھا۔"[1]

یہ ہیں بارکلے کے اس عجیب و غریب نظریئے کے صاف معنے اسی کے الفاظ میں حقیقی وجود نفس مدرکہ کا وجود ہے، خارجی اشیا محض ایک ظلی یا شبہی وجود رکھتے ہیں، اگر آفتاب کا وجود نہ ہو تو نہ نور کا وجود ہو سکتا ہے اور نہ سایہ کا، اسی طرح جب نفسِ مدرکہ نہیں تو خارجی دُنیا کا بھی وجود نہیں۔ اشیا، اپنے وجود میں نفس کے محتاج ہیں۔

اب ہیں یہ دیکھنا ہے کہ بارکلے اس دعوے کو کہ براہ راست محسوس ہونے والی شئے تصور ہے کس طرح ثابت کرتا ہے۔ وہ کسی ایک شئے کو لیتا ہے اور اس کو اس کے اجزا میں تقسیم کرتا ہے۔ فرض کرو یہ سامنے رکھا ہوا پھول جس کا ہمیں اس وقت خوشگوار احساس ہو رہا ہے، اس کی ہم نے تحلیل کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ رنگین ہے، خوش بُو رکھتا ہے، نرم ہے اور گول ہے، یعنے ہمیں اس کا علم اس کی صفات کے مجموعے کے طور پر ہو رہا ہے۔ اب بارکلے کہتا ہے کہ اگر یہ بتلا دیا جائے کہ ان صفاتِ مدرکہ میں سے ہر صفت نفسِ مدرکہ سے مستقل و غیر محتاج ہو کر نہیں پائی جا سکتی تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ خود شئے مدرکہ بھی شعور کی ایک کیفیت ہے۔ بارکلے اپنے پیش رو لاک کی طرح یہ ثابت کرتا ہے کہ رنگ، بُو، مزہ وغیرہ (ثانوی صفات) خارج میں نہیں پائے جاتے بلکہ ذہن میں پائے جاتے ہیں: اس لیے کہ نفسِ مدرکہ کے

---

[1] مبادی علم انسانی۔ بند ۳۔

تغیر کے ساتھ ان میں بھی تغیر رو نما ہوتا ہے۔ اگر یہ صفات مادی اشیاء کی صفات ہوتیں جو اپنے وجود میں نفس سے غیر محتاج ہوتیں تو ظاہر ہے کہ نفس کے تغیر کے ساتھ ان میں تغیر پیدا نہ ہوتا۔ برکلے کا یہ استدلال، استدلالِ اضافیت کہلاتا ہے۔

اپنی کتاب "مکالمات مابین ہائلس و فلونیس" میں وہ اس استدلال کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے :-

فلونیس : "فرض کیجئے آپ کا ایک ہاتھ گرم ہے اور ایک سرد، اور آپ دونوں کو ایسے پانی میں ڈال رہے ہیں جو زیادہ گرم ہے اور نہ زیادہ سرد، تو کیا آپ کو ایک ہی وقت میں (دو مختلف ہاتھوں کی وساطت سے) پانی گرم و سرد دونوں نہ معلوم ہوگا ؟

ہائلس : ہاں ہوگا تو،

ف : اور ایک شئے کا ایک ہی وقت میں گرم و سرد ہونا آپ ابھی محال تسلیم کر چکے ہیں،

ہائلس : جی،

ف : معلوم یہ ہوا کہ جس مسئلے کی بنا پر تناقض یا استحالہ لازم آتا ہے وہی سرے سے غلط ہے، آپ خود اقرار کر چکے ہیں جو مقدمات ایک نتیجۂ محال تک پہنچاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہو سکتے"[1]

یعنے اگر روز مرہ کے نظریے کی بنا پر سردی اور گرمی کو ایسی صفات مانا جائے جن کا ایک ایسی شئے سے تعلق ہے جو شعور سے مستقل و غیر محتاج طور پر پائی جاتی ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک شئے وقتِ واحد میں دو متضاد صفات کی حامل ہے یعنے سرد بھی ہے اور گرم بھی۔ اور یہ بہ قول برکلے کے بیہودگی کا قایل ہوتا ہے۔ گو ایک شئے ایک ہی وقت میں سرد و گرم نہیں ہو سکتی لیکن یہ مانا جا سکتا ہے کہ نفسِ مدرکہ ایک ہی وقت میں گرمی اور سردی کے

---

[1] ۔ مکالمات مترجمۂ عبدالماجد صفحہ (۱۲)۔

تصوّرات رکھ سکتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گرمی و سردی کا وجود خارجی نہیں بلکہ محض ذہنی ہے۔ نہ صرف سردی اور گرمی میں مدرک کے ساتھ تغیر پیدا ہوتا ہے بلکہ یہی حال ذایقہ کا بھی ہے۔ "کیا شیرینی بعض امراض کی حالت میں تلخ نہیں معلوم ہونے لگتی؟ کیا یہ آئے دن کا مشاہدہ نہیں کہ جو غذائیں ایک شخص کو لذیذ معلوم ہوتی ہیں، دوسرے کو ان سے نفرت ہوتی ہے؟ اب اگر ہر شے میں فی نفسہ ایک خاص قسم کا ذایقہ موجود رہتا ہے تو اختلاف و تنوعِ ذوق کی علت کیا ہوسکتی ہے؟"[1] برکلے کے معنے صاف ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم غذا کے ذایقہ کے وقت کسی ایسی شئے کی صفت کا احساس کر رہے ہیں جو ہم سے مستقل و غیر محتاج طور پر خارج میں پائی جاتی ہے تو مختلف لوگوں کے لیے اس غذا کا ذایقہ وہی ایک ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ایک ہی غذا مختلف لوگوں کو مختلف معلوم ہوتی ہے؛ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مختلف ذایقے مختلف لوگوں کے مختلف تصوّرات ہیں۔ بالفاظ دیگر ذایقہ کا وجود خارجی نہیں بلکہ محض ذہنی ہے۔ یہی حال بُو کا ہے اور آواز کا، یہ بھی مدرک کے تغیر کے ساتھ متغیر ہوتے ہیں۔ مثلاً غلاظت و نجاست جسے جانور شوق سے کھاتے ہیں ان کے لیے وہی بُو نہیں رکھتی جو ہمارے لیے رکھتی ہے۔ لہٰذا مزہ کی طرح بُو بھی محض "ایک اضافی شئے ہے جو جسم حاس یا ذہن پر مشروط ہے۔" رنگ بھی محض ذہنی شئے ہے، خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ کیوں کہ یہ بھی ذہن کے تغیر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ "اَبر کے جو ٹکڑے ہمیں سُرخ و ارغوانی رنگ کے نظر آتے ہیں" یہ فی الواقع ایسے نہیں ہوتے "یہ تو صرف فاصلے کے سبب[2] سے ہم پر ایسے ظاہر ہوتے ہیں" ورنہ یہ "صرف سیاہ رنگ کے بخارات ہوتے ہیں۔"

غرض سردی، گرمی، مزہ، بُو، آواز، رنگ سب کے سب ثانوی صفات ہیں جن کا وجود خارجی نہیں بلکہ ذہنی ہے۔ اسکی دلیل ان کی اضافیت ہے، یعنے یہ ذہن کے تغیر کے ساتھ

---

[1] مکالمات مترجمۂ عبدالماجد صفحہ (۱۹)۔

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 (۲۴۰)۔

خود بھی متغیر ہوتے ہیں۔ اگر ان کا تعلق کسی ایسی شئے سے ہوتا جو اپنے وجود میں شعور سے غیر محتاج اور مستقل ہوتی تو ذہن کے تغیر سے ان میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ پہلا استدلال جس کی بنا پر صفات ثانویہ کو ذہنی ثابت کیا گیا ہے۔ لاک نے بھی ان صفات کو صفات ثانویہ کہہ کر ان کو ذہنی ثابت کیا تھا۔ برکلے نے ڈیکارٹ اور لاک کے براہین کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور بس۔

یہاں پر ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس معاملے میں لاک اور برکلے کے انکشافات جدید سائنس کی تحقیقات کے بالکل موافق ہیں۔ علمائے طبیعیات کی بھی یہی تعلیم ہے کہ خارجی مادی دنیا میں رنگ و بو، آواز، سردی، گرمی کا وجود نہیں۔ یہ سب محض تصورات ہیں اور ان تصورات کی حقیقی علل ارتعاشات ہیں۔ مثلاً جب ارتعاشات شبکیۂ چشم پر اثر انداز ہوتے ہیں تو ذہن رنگ کا تصور قایم کرتا ہے اور جب ان کا اثر کان کے پردے پر ہوتا ہے تو آواز کا۔ پروفیسر وائٹ ہڈ کی کتاب "سائنس اور دُنیائے جدیدہ" میں ایک مشہور عبارت ہے جس میں وہ اس رائے کو بڑی خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے:۔ "اجسام کا ادراک اس طرح ہوتا ہے کہ گویا یہ درحقیقت صفات کے حامل ہیں حالانکہ ایسا نہیں، صفات فی الحقیقت محض ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس طرح فطرت کو وہ عزت دی جاتی ہے جو صرف ہمارے لیے ہی مخصوص ہونی چاہیئے تھی پھول اپنی بو کے لیے: بلبل اپنے نغموں کے لیے اور آفتاب اپنے نور کے لیے عزت پاتا ہے۔ شعرا سرے سے مغالطے میں مبتلا ہیں۔ غزلوں میں ان کا روئے خطاب خود ان کی اپنی جانب ہونا چاہیئے، اور ان غزلوں کو ذہن انسانی کی فضیلت و برتری کی مبارک بادیوں میں بدل دیا جانا چاہیئے۔ فطرت ایک بے کیف سی چیز ہے جو رنگ و بو اور آواز سے معرّی ہے؛ یہ صرف ذرات کی حرکت ہے جو ایک لامتناہی و بے معنے چیز ہے"۔

نہ صرف صفاتِ ثانویہ بلکہ لاک جن چیزوں کو صفاتِ اولیہ کہتا ہے ان سے بھی برکلے دُنیا کو محروم قرار دیتا ہے۔ اس معاملے میں وہ لاک سے ایک قدم آگے بڑھاتا ہے اور بالکل صحیح طور پر۔ کیونکہ جس استدلال (اضافیت) کی بنا پر لاک رنگ و بو وغیرہ صفاتِ ثانوی کو ذہنی قرار دیا تھا بالکل اسی استدلال سے برکلے امتداد صلابت و حرکت کو بھی

ذہنی قرار دیتا ہے۔ برکلے کی بے پناہ منطق کا اندازہ مکالمات کی مندرجۂ ذیل عبارت سے قایم ہو گا جس میں وہ امتداد کو ذہنی ثابت کر رہا ہے۔ فلونیس، برکلے کے خیالات کا نمایندہ ہے اور ہائلس مادّے کا قایل۔ عبارت کچھ طویل ہے لیکن اس سے طالب علم کو مکالمات کی کچھ چاشنی حاصل ہو جائے گی جس کا پڑھنا اس کے لیے ضروری ہے:۔

فلونیسؔ : آپ کے خیال میں شکل و امتداد جن کا ہم حواس کے ذریعے سے ادراک کرتے ہیں خارج یا جوہر مادّی میں وجود رکھتے ہیں؟

ہائلس : رکھتے ہیں،

ف : اسی طرح حیوانات بھی اس محسوس کردہ شکل و امتداد کو موجود فی الخارج سمجھتے ہوں گے؟

ہائلس : ہاں اگر ان کے سمجھ ہو تو ضرور ایسا سمجھتے ہوں گے۔

ف : اب یہ فرمائیے کہ حیوانات میں وجودِ حواس کا مقصد کیا ہے؟ صیانت حیات ہی جیسا کہ انسان میں ہے یا کچھ اور؟

ہائلس : ہونا تو یہی چاہیے،

ف : اچھا جب یہ ہے تو کیا اس غرض کے لیے یہ لازمی نہیں کہ وہ اپنے اعضا کا نیز ان اجسام کا جو انھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں، ادراک کرتے ہیں

ہائلس : ضرور ہے،

ف : اس بنا پر ایک جھنگے کو اپنی ٹانگ بلکہ اس سے بھی چھوٹے اجسام پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتے ہوں گے، حالانکہ وہ ہمارے لیے بالکل یا تقریباً بالکل غیر مرئی رہتے ہیں۔

ہائلس : ہاں یہ تو ہے،

ف : اور جھنگے سے حقیر تر حیوانات کو یہ اجسام اور بھی بڑے معلوم ہوں گے۔

ہائلس : بلا شک،

ف : گویا جو اجسام ہمارے آپ کے لیے غیر مرئی ہیں وہ بعض حیوانات کو

پہاڑ کے اتنے عظیم الشان معلوم ہوتے ہوں گے؟

ہائلس: ظاہر ہے،

ف: لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شئے ایک ہی وقت میں بڑی بھی ہو اور چھوٹی بھی؟

ہائلس: قطعاً محال ہے،

ف: لیکن آپ تو خود اپنے ہی اصول کے لحاظ سے اس استحالہ کے مرتکب ہو رہے ہیں، خود آپ ہی کے مسلّمات سے لازم آتا ہے کہ بھنگے کی ایک ٹانگ ایک ہی وقت میں اتنی چھوٹی بھی ہوتی ہے کہ نظر تک نہیں آتی اور اتنی بڑی بھی ہوتی ہے کہ پہاڑ کی اتنی جسامت رکھتی ہے (اور اگر فی الواقع ایسا نہیں ہے، بلکہ جسامت کی کلانی وخردی صرف دیکھنے والے نقطۂ خیال کے تابع ہے تو صاف امتداد یا جسامت کا اضافی ہونا لازم آئے گا)۔

ہائلس: ہاں، یہ دشواری تو ضرور پڑتی ہے،

ف: اس کے علاوہ آپ کو اپنا یہ اصول یاد ہے کہ جوہر کے کسی عرضِ حقیقی میں تغیر نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ خود اس جوہر میں کوئی تغیر نہ ہو؟

ہائلس: یاد ہے، اور اُس پر قایم ہوں،

ف: لیکن یہ عام مشاہدہ ہے کہ ہر شئے کی جسامت مری کا دارو مدار دیکھنے والے کے فاصلے پر ہے، قریب سے دیکھیے تو یہ چیز بڑی معلوم ہوتی ہے اور دُور سے دیکھیے تو چھوٹی، یہاں تک کہ جسامت کا یہ فرق بعض دفعہ دہ چند بلکہ صد چند ہو جاتا ہے، کیا اس کے بعد بھی آپ یہی کہے جائیں گے کہ جسامت، عرضِ اضافی نہیں بلکہ حقیقی ہے؟

ہائلس: ہاں، اس کا جواب تو سمجھ میں نہیں آتا،

ف: سمجھ میں جب ہی آئے گا جب آپ دیگر اعراض کی طرح اس غرض سے متعلق بھی پوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ غور کو کام میں لائیے گا،

یاد کیجئے کہ حرارت پر بحث کرتے ہوئے یہ اصول طے ہو چکا تھا کہ چونکہ پانی بھی ایک وقت میں ایک ہاتھ کو گرم اور دوسرے کو سرد معلوم ہوتا ہے اس لیے ثابت یہ ہوا کہ حرارت و برودت فی نفسہ پانی میں داخل نہیں،

ہائلس: ہاں، یہ تو یاد ہے،

ف: بس تو ٹھیک اسی اصول پر فیصلہ ہوا جاتا ہے کہ کسی شئے کی کوئی حقیقت جسامت و شکل نہیں ہوتی، اس لیے کہ جو شئے ایک آنکھ کو چھوٹی ہموار اور گول معلوم ہوتی ہے، وہی دوسری آنکھ کو بڑی ناہموار اور زاویہ دار معلوم ہوتی ہے،

ہائلس: ایسا بھی ہوتا ہے؟

ف: جب چاہے تجربہ کر لیجیے، ایک آنکھ خالی رکھئے اور دوسری سے بذریعہ خوردبین دیکھئے یہی معلوم ہوگا،

ہائلس: خیر میں لاجواب تو ہو گیا لیکن طبیعت نہیں مانتی کہ جسامت کے وجودِ حقیقی سے انکار کردوں، اس سے تو عجیب و غریب نتایج پیدا ہوں گے،

ف: آپ اس انکار کے نتایج کو عجیب کہتے ہیں، مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے (کیونکہ دراصل جسامت سے انکار حیرت انگیز نہیں بلکہ تمام دیگر اعراض کے وجودِ حقیقی کے ابطال کے بعد صرف ایک جسامت کے وجودِ حقیقی کو تسلیم کرتے رہنا بے شبہ حیرت انگیز ہے، اگر یہ سچ ہے کہ کوئی تصور، یا مثل تصور کسی جوہر غیر حاس میں موجود نہیں ہو سکتا تو یہ بھی یقینی ہے کہ کوئی شکل یا جسامت جسے ہم تصور کر سکتے ہیں مادے میں وجودِ حقیقی نہیں رکھ سکتی اور خود ایسے جوہر مادی کے وجود کے تسلیم کرنے میں جو جسامت کا حامل ہو جو دشواریاں ہیں ان کا ذکر ہی نہیں، غرض یہ کہ ہر قسم کے عرض کا، خواہ شکل ہو یا آواز، یا رنگ ہو کسی غیر حاس مادے میں موجود ہونا یکساں ناممکن ہے۔[1]

---

[1] مکالمات مترجمہ عبد الماجد صفحہ (۳۰ تا ۳۳)۔

برکلے ان ہی دلایل کی بنا پر صلابت و حرکت کو بھی امتداد کی طرح ذہنی قرار دیتا ہے[۱]

اس طرح مادی دُنیا کے متعلق ڈیکارٹ اور لاک کا جو نظریہ تھا (اور جو جدید سائنس کے بالکل مطابق تھا) برکلے کے دلایل کے سامنے وہ بالکل غیر متوافق و متناقض قرار پاتا ہے۔ اس مانوس و مشہور نظریے کی رو سے صفاتِ ثانویہ یعنے رنگ، آواز، مزہ اور بُو ذہنی کیفیات ہیں جو شکل و حرکت کی موجود فی الخارج حقیقی مادی صفات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر خارجی دُنیا شکلِ امداد اور حرکت کی دُنیا ہے، رنگ و بُو کی دُنیا ذہن کی آفریدہ ہے لیکن برکلے نے دلایلِ قاطعہ کی رُو سے جو چیز ثابت کر دکھائی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ جو دلیل لاک کو اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ رنگ و بُو وغیرہ حقیقی صفات نہیں جو مادی اشیا میں پائی جائیں وہ صرف یہ ہے کہ نفسِ مدرک کے تغیر کے ساتھ یہ بھی بدلتی جاتی ہیں (دلیلِ اضافیت)؛ لیکن امتداد صلابت حرکت وغیرہ بھی اسی طرح قابلِ تغیر ہیں، لہذا یہ بھی رنگ و بُو کی طرح ذہن کے تصورات ہیں۔ ایک لفظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ صفات اشیا کے ایک مجموعے اور دوسرے مجموعے میں امتیاز کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ برکلے کی منطق ناقابلِ تردید ہے۔

لیکن خود برکلے اس استدلالِ اضافیت پر زیادہ زور نہیں دیتا اور نہ ہی اس کی اتنی اہمیت مانتا ہے[۲]۔ وہ ایک دوسری دلیل زیادہ اہم اور زیادہ بنیادی اس یقین کے ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ اشیا، و صفات جن کو ہم براہِ راست دیکھتے، چھوتے، اور محسوس کرتے ہیں ذہن سے غیر محتاج اور مستقل طور پر نہیں پائی جاتیں۔ اس دلیل کی ساری بنیاد تامل یا مطالعۂ باطن پر مبنی ہے۔ مختصراً وہ اس طرح ادا کی جا سکتی ہے: جب میں اپنے آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ادراک کرتے وقت مجھے کس چیز کا براہِ راست اور بدیہی طور پر یقین ہوتا ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے بدیہی طور پر یہ یقین حاصل ہے کہ مجھے ایک نہ ایک طرح پر شعور ہو رہا ہے۔ مثلاً جب میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے ایک گلِ سُرخ کے وجود کا براہِ راست یقین حاصل ہے تو ٹھیک وہ کیا شئے ہے

---

[۱] دیکھو مکالمات، مترجمہ عبدالماجد صفحہ (۳۳) سطر (۲۴)۔

[۲] دیکھو مبادی علم انسانی بند (۱۵)۔

جس کا بداہتہً مجھے یقین ہے ؟ مجھے یقین ہے کہ مجھے سُرخی، سبزی، خوش بُو، سردی، حاریت کے حسی تجربات ہو رہے ہیں۔ میرے حسی تجربات کے اس مرکب واقعہ کے علاوہ شئے میں کوئی اور چیز مطلق نہیں جس کا مجھے یقین ہو۔ شاید مجھے اس سے زیادہ کا بھی یقین ہوتا ہے لیکن میرے یہ دوسرے تیقنات، اگر وہ وجود رکھتے ہوں تو اس بدیہی یقین کے محض استاجات ہیں اس طرح ہر شخص اپنے شعور کی طرف رجوع کر کے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ خارجی شئے جہاں تک کہ اس کا براہِ راست علم ہوتا ہے شعور کی ایک کیفیت ہے اور اس سے مستقل و غیر محتاج طور پر نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا شئے ایک تصور ہے[1] خود برکلے کے الفاظ یہ ہیں: "یہ ایک عجیب رائے عوام الناس میں پائی جاتی ہے کہ مکان، پہاڑ، دریا، بہ الفاظ مختصر تمام اشیائے محسوسہ اپنے وجود میں خواہ یہ فطری ہو یا حقیقی، ادراک بالفہم کے محتاج نہیں۔ لیکن کتنے ہی یقین کے ساتھ یہ اصول کیوں نہ مانا جائے اور اس کی اتباع کیوں نہ کی جائے۔ . . . جو شخص بھی اس پر اعتراض کرنے کی جرات رکھتا ہو . . . . وہ اس میں ایک بدیہی تناقض ضرور پائے گا کیوں کہ مذکورۂ بالا اشیاء وہی چیزیں تو ہیں جن کا ہمیں حواس کے ذریعے ادراک ہوتا ہے، اور ہمیں سوائے اپنے تصورات و حسیات کے ادراک کس چیز کا ہوتا ہے ؟ اور کیا یہ ایک متضاد سی بات نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک یا ان کا کوئی ایک مجموعہ بغیر محسوس ہونے کے پایا بھی جائے۔"[2] Esse est percipi

غرض برکلے نے دو دلایل (اضافیت، ومطالعۂ باطن) کی رو سے یہ ثابت کر دکھلایا کہ ہر شئے کی ماہیت وہی ہے جو تصور کی ماہیت ہے، وجود اشیاء، مدرکیت اشیاء کے برابر ہے حقیقت مشتمل ہے نفوس مدرکہ اور ادراکات پر، فکر و مفکر پر۔

یہاں پر معترض کے ذہن میں برکلے کے اس نظریے پر چند سنگین اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ برکلے ان میں سے بعض کا خود اپنی کتابوں میں ذکر کرتا ہے، ان میں سے ایک یہاں قابل ذکر ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ برکلے کی تصوریت حقیقت و التباس کے فرق کو

---

[1] ۔ دیکھو میری کالکنس کی کتاب "دی پرسسٹنٹ پرابلمز آف فلاسفی" صفحہ (۱۲۳)۔

[2] ۔ مبادی علم انسانی، بند (۴)۔

مٹا دیتی ہے۔ پہاڑوں، چٹانوں اور سمندروں کی حقیقی اور ٹھوس دُنیا برکلے کے اصول کی رو سے محض ایک التباس یا گریزپا، غیر حقیقی مظاہر کا ایک سلسلہ قرار پاتا ہے۔ کیا ایک حقیقی اشرفی اور محض خیالی اشرفی میں کوئی فرق نہیں؟ چُونے اور گچ کے قلعے اور ہوائی قلعے میں کوئی امتیاز نہیں؟ برکلے کے قول کی رو سے تو حقیقی اشرفی اور چُونے اور گچ کا قلعہ محض تصورات ہیں جن کا خارج میں ذہن سے مستقل کوئی وجود نہیں! پھر ہمارے تجربے کے اس فرق و امتیاز کی توجیہ؟

اسی اعتراض کو برکلے اپنی زبان میں اس طرح ادا کرتا ہے: "اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اصول کی رو سے فطرت میں جو بھی حقیقی و صحیح شئے ہے وہ دُنیا سے غائب ہو جاتی ہے اور اس کی بجائے تصوّرات کا ایک وہمی نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں وجود رکھتی ہیں صرف ذہن میں ہیں ..... تو پھر چاند، سُورج اور ستاروں کا کیا حال ہوا؟ تو پھر مکانوں، پہاڑوں، دریاؤں اور پتھروں اور خود ہمارے جسموں کے متعلق ہم کیا خیال کریں؟ کیا یہ سب محض اضغاث احلام یا واہمہ کے التباسات ہیں؟ ان کا اور ان کے مماثل تمام اعتراضات کا میں یہ جواب دیتا ہوں، ..... کہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے، سُنتے، چھُوتے یا کسی اور طریقے سے ان کا تعقل کرتے ہیں وہ ویسی ہی محفوظ رہتی ہیں جیسی وہ پہلے تھیں اور ایسی ہی حقیقی ..... جن چیزوں کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور اپنے ہاتھوں سے چھُوتا ہوں ان کا وجود حقیقی طور پر پایا جاتا ہے اور ان کے متعلق مجھے کوئی شُبہ نہیں"۔[1]

بارکلے بتلاتا ہے کہ وہ 'حقیقت' اور 'التباس' میں آخر کیا فرق سمجھتا ہے۔ اس کو اس امر پر اصرار ہے کہ جن اشیاء کو ہم بدیہی طور پر دیکھتے ہیں اور چھُوتے ہیں حقیقی ہونے کے باوجود تصوّرات ضرور ہیں۔ "حقیقی اشیاء" (یعنے وہ تصوّرات جو ہمارے حواس پر مرتسم ہوتے ہیں) اور محض تخیّل کے "تصورات" (التباسات) میں دوگونہ فرق ہے۔

(۱) حقیقت یا حقیقی اشیاء (یعنے وہ تصوّرات جو ہمارے حواس پر مرتسم ہوتے ہیں) میرے

---

[1] ۔ مبادیٔ علم انسانی، بند (۳۴ و ۳۵)۔

"ارادے کے تابع اور محتاج نہیں ہوتے"، یہ ذہن یا تخیل کے پیدا کردہ تصورات سے زیادہ واضح، قوی، وممیز ہوتے ہیں، اوران میں زیادہ ترتیب و نظم ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اشیائے محسوسہ کی حقیقت اس امر پہ مشتمل نہیں کہ وہ ذہن سے غیر محتاج اور مستقل طور پر پائے جاتے ہیں، بلکہ اس امر پہ کہ یہ ایسے تصورات' ہیں جن میں زیادہ وضاحت اور ترتیب و نظم پائے جاتے ہیں اور وہ میرے ارادے کے تابع نہیں۔

(ii) دوسرا فرق یہ ہے کہ حقیقی اشیاء (تصورات حواس) کسی منفرد، محدود ذات کے تصورات نہیں بلکہ ایک روح لامتناہی، خدا کے تصورات ہیں۔ چونکہ یہ میرے ارادے کے تابع نہیں اور خارج سے مجھ پر وارد و عاید ہوتے ہیں لہٰذا وہ میرے تخیل کے پیدا کردہ نہیں ہوسکتے اور نہ ہی کسی جوہر مادی کے پیدا کردہ (کیوں کہ اس کا سرے سے وجود ہی نہیں پایا جاتا) لہٰذا یہ ایک روحِ فعال کے پیدا کردہ ہیں جو ہم سے خارج میں موجود ہیں۔ بقول برکلے:

"وجود صرف اشیائے محسوسہ واشیائے حاسّہ کا ہے...... ہر غیر ذی فکر وجود ضروری طور پر اور اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے کسی ذہن سے محسوس ہوتا ہے! اگر کسی متناہی ومخلوق ذہن سے نہیں تو یقیناً خدا کے لامتناہی ذہن سے جس میں ہم جیتے بستے ہیں۔"[1]

برکلے اگر خدا کے وجود کو ثابت کر دکھائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حقیقی اشیاء کا تمثالاتِ ذہنی سے اسی وجہ سے امتیاز کیا جاسکتا ہے کہ اول الذکر اولاً خدا کے ذہن میں پائی جاتی ہیں۔ بہر حال ان کا غیر ارادی ہونا، ان کی ترتیب و نظم، ان کو بہ مقابلہ تصوراتِ تخیل ایک قسم کی مخصوص حقیقت ضرور بخشتی ہے۔ اوران کی یہ خصوصیت انھیں التباس سے ممیز کرنے کافی ہے۔

معترض ایک دوسرا اہم اعتراض پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جو اشیاء ہمیں براہِ راست محسوس ہوتی ہیں "تصورات" ہیں تو کیا یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ عالم اشیاء کا وجود ہو، یہ وجود ذہن سے مستقل و غیر محتاج ہو لیکن یہ ہمارے ادراکات یا تصورات کے

---

[1] مکالمات (انگریزی صفحہ ۹۱)۔

بالکلیہ مشابہ ہو اور اس کے وجود تک ہم بدیہی ادراک کے ذریعے نہیں بلکہ انتاج کے ذریعے پہنچتے ہوں؟ اگر یہ امکان صحیح ہو تو پھر صورتِ حال یہ ہو گی: ایک حقیقی عالم پایا جاتا ہے جو باوجود غیر مدرک و غیر محسوس ہونے کے رنگ و بُو و امتداد رکھتا ہے، اور ہمارے ادراکات و تصوّرات اس حقیقی عالم کی حقیقی اشیاء کی محض نقلیں ہیں۔ یعنے جو اشیاء ہمیں براہِ راست بدیہی طور پر محسوس ہوتی ہیں وہ بے شک تصوّرات ہیں، اپنے وجود میں ذہن سے مستقل و غیر محتاج نہیں، لیکن یہ محض نقول ہیں ان اشیاء کی جو موجود بالذات ہیں یعنے اپنے وجود میں ذہن کے محتاج نہیں اور جو رنگ و بُو و امتداد وغیرہ رکھتی ہیں اور جن کا وجود بذریعۂ انتاج اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اس نظریے کے خلاف برکلے کے دو سخت اعتراضات ہیں:۔

(۱) اگر ہم یہ مان لیں کہ تصوّرات کے مثل و مشابہ موجوداتِ خارجی پائے جاتے ہیں تو ہمیں ایک نئی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ ہمارے تصورات کے متعلق تو سبھوں کو اتفاق ہے کہ یہ تغیر و تبدل پذیر ہیں۔ اب اگر ہمارے تصوّرات موجوداتِ خارجی کے بالکل مشابہ ہیں تو یہ لازم آتا ہے کہ موجوداتِ خارجی ہمارے کئی ایک مختلف و متضاد تصوّرات کے بالکل مشابہ ہوں گے۔ ان کا ماننا تو بیہودگی ہو گی۔ مثال پر غور کرو۔ حقیقی ٹمپریچر تو وقتِ واحد میں سرد اور گرم نہیں ہو سکتا، وہ یا تو سرد ہو گا یا گرم، لیکن ایک شخص کے لیے یہ کمرہ سرد ہو سکتا ہے اور دوسرے کے لیے گرم۔ فلونیس اسی خیال کو اس طرح ادا کرتا ہے:۔

> "کیا یہ ممکن ہے کہ تصوّرات جیسی متلون و تغیر پذیر چیزیں نقل یا عکس ہوں مستقل و قایم بالذات چیزوں کی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اعراض محسوسہ قد و قامت، شکل و رنگ وغیرہ جو تمام تر اضافی و اعتباری ہوتے ہیں اور جن میں اختلافِ حالات کے ساتھ ہر لحظہ و ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے، وہ صحیح تصویر ہو سکیں ان موجوداتِ خارجی کی جن کا وجود بالکل مستقل و قایم بالذات ہوتا ہے۔"[۱]

۱۔ مکالمات، مترجمہ عبدالماجد صفحہ (۵۶)۔

(ii) دوسرا اعتراض اور زیادہ اہم ہے۔ ذہن سے مستقل و غیر محتاج حقیقت کسی معنے میں اسی شئے کے مشابہ نہیں ہوسکتی جو اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے ذہنی ہو یا جو شعور کی ماہیت رکھتی ہو۔ "مادّی شئے" سے مُراد وہ ہے جو ضد ہو ذہنی شئے کی۔ لہٰذا کوئی مادّی شئے کسی تصوّر کے مشابہ نہیں ہوسکتی۔ معترض کو اس سوال کا جواب دینا پڑتا ہے کہ :۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ کسی غیر مُدرِک اصل کی نقل مُدرِک ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ رنگ نقل ہو کسی غیر مرئی اصل کی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حِس یا تصوّر بجز حِس یا تصوّر کے کسی اور شئے کی نقل ہوسکے؟"[1]

ان اعتراضات کی بنا پر برکلے کہتا ہے کہ ایسی مادّی دُنیا کا ماننا جو ہمارے تصوّرات کے مشابہ ہو صحیح نہیں ہوسکتا۔ مادّہ یعنے وہ جو ہر جو ذہن سے غیر محتاج و مستقل طور پر پایا جاتا ہے اور جو اپنی ماہیت میں ذہن سے بالکلیہ مختلف ہے وجود نہیں رکھتا، یہ ایک تجرید محض ہے۔

برکلے کے نظریۂ تصوّریت کے خلاف معترض ایک اور اعتراض پیش کرتا ہے۔ مانا کہ ایسی مادّی حقیقت جو ہمارے تصوّرات کے بالکل مشابہ و مماثل ہو نہیں پائی جاسکتی لیکن بہر صورت یہ ممکن ہے کہ ایسی مادّی حقیقت کا تو وجود ہو گو یہ ہمارے تصوّرات کے مماثل نہ سہی۔ یعنے جب تصوّرات کے مماثل مادّی حقیقت کے ماننے میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو پھر ایسی حقیقت کو تو مانا جاسکتا ہے جو ہمارے تصوّرات کے مماثل و مشابہ نہیں لیکن ان کی علت ہے یا ان کے ہم میں پیدا کرنے کا باعث ہے۔ کیونکہ یہ تو ہم اوپر مان آئے ہیں کہ تصوّرات کی دو قسمیں ہوتی ہیں، تصوّرات حواس اور تصوّرات تخیل۔ تصوّرات حواس ہمارے ذہن کے پیدا کردہ نہیں بلکہ خارج سے ہم پر وارد ہوتے ہیں۔ اب خارج میں کوئی ایسی حقیقت ہونی چاہیئے جو ان تصوّرات کا مبدء ہو اور یہ حقیقت ہمارے ذہن سے مستقل اور غیر محتاج ہوگی۔ کیا اسی حقیقت کو مادہ نہیں کہا جاسکتا؟[2]

---

[1] مکالمات، مترجمۂ عبدالماجد صفحہ (۵۶ و ۵۷)۔

[2] " " دوم " " "۔

بارکلے اس کے جواب میں کہتا ہے کہ بے شک ہمارے تصوّرات حواس کی ایک خارجی علت ضرور ہونی چاہیئے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ یہ علت صرف مادّہ ہی ہو۔ انسان کے محدود ذہن پر ان تصوّراتِ حواس کے ارتسام کی علت ایک نامتناہی روح بھی ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں مادّہ اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے کسی شئے کی علت ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ مادّہ ایک منفعل، غیر شاعل، جامد، عدیم الحرکت جوہر مانا جاتا ہے۔ "جو شئے عدیم الحرکت ہو وہ علت کیسی ہوسکتی ہے؛ اور جو غیر ذی فکر ہو فکر کی کیسی علت بن سکتی ہے؟" گویا مادّے کے علت ہونے کے خلاف بر کلے دو دلایل پیش کرتا ہے: (۱) منفعل و عدیم الحرکت ہونے کی وجہ سے مادّہ علت نہیں ہوسکتا؛ اور (۲) اگر فاعل بھی ہوا اور اس وجہ سے علت ہو تو غیر ذی فکر ہونے کی وجہ سے وہ فکر کی علت نہیں ہوسکتا۔

جیساکہ پروفیسر کالکنس[۱] نے بتلایا ہے کہ بارکلے کے یہ دونوں دلایل کمزور ہیں، لیکن بارکلے اپنے دعوے کے ثبوت میں ان ہی دلایل کا محتاج نہ تھا۔ دوسری دلیل پر پہلے غور کرو۔ یہ مان لیا جاسکتا ہے کہ مادّہ غیر ذی فکر یا غیر شعوری ہے۔ تعریف ہی کی رو سے مادّہ وہ ہے جو شعور نہیں لیکن یہ امر بدیہی نہیں کہ غیر ذی شعور ہستی شعور کے مظاہر کی علت نہیں ہوسکتی۔ علت و معلول کے باہمی ربط کے متعلق ہمارا علم اس قدر کم ہے کہ ہم ادعائیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ دونوں ایک ہی نوعیت کے ہونے چاہئیں علیت کے جو واقعات زیرِ مشاہدہ آتے ہیں ان میں تو علت و معلول کا فرق نہایت نمایاں ہوتا ہے، جیسے برقی عمل عضویاتی معلولات پیدا کرتے ہیں۔ برکلے اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتا کہ غیر شعوری شئے شعور کی علت نہیں ہوسکتی۔ یہ محض ایک ادّعا ہے جس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا، لہذا پاک باز بارکلے سے مادیت کا حامی کہہ سکتا ہے کہ:- ع

اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اب ہمیں مجبوراً دوسری عام دلیل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے کہ مادّہ منفعل و جامد

---

[۱] دیکھو کالکنس کی محولۂ بالا کتاب صفحہ (۱۲۹ وغیرہ)۔

ہونے کی وجہ سے کسی چیز کی علت نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صحیح ہے کہ علت کا فاعل ہونا، یا اس میں فعلیت کا پایا جانا عام طور پر مانا جاتا ہے اور اگر مادہ غیر فاعل ہو تو وہ علت بھی نہیں ہو سکتا لیکن اعتراض یہ ہوتا ہے کہ برکلے کو بغیر حجت و دلیل کے یہ فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ مادّہ عدیم الحرکت، جامد، اور منفعل ہے۔ سائنس کی جدید تحقیقات تو یہ بتلا رہی ہیں کہ خارجی حقیقت کوئی جامد مادّہ نہیں بلکہ توانائی ہے اور یہ کوئی عدیم الحرکت و منفعل شئے نہیں۔

اس اعتراض کی صداقت ماننی پڑتی ہے لیکن دیکھو برکلے کے اصول پر، بغیر مادّے کے جمود کی دلیل استعمال کیے برکلے کی ایک شاگرد، مریم کالکنس[1]، تصوریت کی کس طرح حمایت کرتی ہے۔ جدید سائنس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "توانائی" (انرجی) کا مفہوم یا تو حرکت (توانائی بالفعل) لیا جاتا ہے، یا "حرکت کی کوئی ناقابل تحویل علت" یا محض "وہ شئے جس کی صورتیں تو متغیر ہوتی ہیں لیکن جس کی کمیت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔"

توانائی کے ان تینوں مفاہیم کے خلاف برکلے کی اصولی دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ اگر توانائی کا مفہوم حرکت ہے تو آپ نے اوپر دیکھ ہی لیا ہے کہ حرکت حسی عارضہ ہونے کی وجہ سے اپنے وجود میں ذہن کی محتاج ہے؛ اور اگر اس کا مفہوم حرکت کی علت ہے یا "ایک مستقل کمیت" ہے تو یہ ایک منتجہ حقیقت ہو گی جس کی ماہیت کا کوئی تعین نہیں ہو سکتا۔ برکلے اوپر بتا چکا ہے کہ ہم کسی محسوس شئے کا شعور سے خارج میں ادراک نہیں کر سکتے؛ ہر محسوس شئے ذہن کا ایک تصوّر ہے؛ توانائی بحیثیت علتِ حرکت وغیرہ ایک محسوس شئے نہیں بلکہ ایک منتج شئے ہے (جس کا انتاج حرکت کی علت کی حیثیت سے کیا جا رہا ہے)۔ اب ہمارے انتاج کا معروض خود ایک تصوّر یا معروضِ شعور یا واقعۂ ذہنی ہو گا۔ اس طرح توانائی کے یہ دونوں مفہوم بھی مفہوم اوّل کی طرح ذہنی ہوں گے یعنے تصوّر جس کا شعور سے مستقل کوئی وجود نہیں۔ لہٰذا مادّہ تصوّرات کی علت کی حیثیت سے خواہ وہ فعّال سمجھا جائے یا غیر فعّال محض ایک منتجہ شئے یا انتاج کا معروض ہے اس لیے برکلے کے الفاظ میں وہ تصوّر ہے۔

---

[1] دیکھو کالکنس کی محولہ بالا کتاب صفحۂ (۱۲۹، پانچواں ایڈیشن)۔

بار کلے پر اعتراض کرنے والوں کے ہاں ایک اور آخری اعتراض رہ جاتا ہے یہیں اس کی بھی تفصیل بیان کرنی ضروری ہے۔ بار کلے نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے اگر کانٹ اس پر سنجیدگی سے غور کرتا تو کہا جاتا ہے کہ وہ 'شئے کما ہی' کا نظریہ پیش نہ کرتا۔

معترض کہتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہمارے ادراکات کی علت مادی نہیں ہوسکتی، بہ الفاظِ دیگر، شعور سے غیر محتاج نہیں ہوسکتی، تب بھی یہ ایک آخری امکان رہ جاتا ہے کہ مادے کا بالکل سلبی طریقے پر تصور کیا جا کر اس کو موجود فی الخارج مانا جائے۔ مادے کے سلبی تصور سے کیا مراد ہے؟ ہم نے اوپر دیکھا کہ رنگ و بو وغیرہ حتےٰ کہ صورت و حرکت بھی شعوری دنیا میں پائی جاتی ہے، اس سے مستقل و غیر محتاج طور پر نہیں پائی جاتی، علیت بھی ذہنی ہے، مادی نہیں۔ اب اگر مادے کا وجود فرض کیا جائے تو یہ مادہ تمام ایجابی صفات سے محروم ہوگا، یعنے نہ اس میں رنگ و بو ہوگی، نہ اس کی شکل و صورت ہوگی، نہ حرکت اور نہ یہ کسی شئے کی علت ہوگا۔ تاہم تصوریت کے مخالفین کا دعوےٰ ہے کہ کسی ایسی غیر معلوم حقیقت کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا جو شعور سے غیر محتاج طور پر پائی جاتی ہو۔

اوپر توانائی کے ضمن میں جو حجت منتجہ حقیقت کے خلاف پیش کی گئی وہ اس غیر معلوم حقیقت کے خلاف بھی پیش کی جا سکتی ہے "جو نہ جوہر ہے نہ عارضہ، نہ ذی فکر شئے ہے نہ ممتد شئے، نہ علت ہے نہ آلہ نہ موقع بلکہ ایک بالکل نامعلوم شئے"۔ بہ حیثیت ایک منتجہ حقیقت ہونے کے اس کو ذہنی ہونا چاہیئے۔ لیکن بر کلے اس کی تردید میں یہ دلیل پیش نہیں کرتا، وہ دو اور اعتراضات اٹھاتا ہے۔

(۱) وہ کہتا ہے کہ جن فلاسفہ نے مادے کا یہ تصور پیش کیا ہے خود انھوں نے کبھی توافق کے ساتھ اس کو مانا نہیں۔ یعنے اس دعوے کے باوجود کہ ایک مطلقاً غیر معلوم حقیقت کا وجود پایا جاتا ہے، ان فلاسفہ نے اس حقیقت کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ضرور فرض کیا ہے۔ ان کے نزدیک مادہ بالآخر معروضِ علم قرار پاتا ہے اور معروضِ علم بار کلے ثابت کر چکا ہے ذہنی شئے ہے۔

بار کلے کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ کسی فلسفی نے مادے کو توافق کے ساتھ بالکل غیر معلوم

حقیقت قرار نہیں دیا بلکہ ہر ایک نے اس کے متعلق کسی نہ کسی قدر علم کا دعوےٰ ضرور کیا ہے۔ ایک تازہ مثال کے طور پر ہربرٹ اسپنسر کو لو۔ وہ انتہائی حقیقت کے ناقابل علم ہونے کی تعلیم دیتا ہے، تاہم وہ اسی ناقابل علم حقیقت، کو علتِ آخری، اور "ساری اشیاء کا مبدء" قرار دیتا ہے۔ اس کے معنے تو یہی ہوئے کہ اسپنسر کو اس کے متعلق اتنا تو مسلم ہے کہ یہ اشیاء کی علت ہے۔

(۲) اب اگر سنجیدگی کے ساتھ یہ مان لیا جائے کہ مادے کا ہمیں مطلقاً کوئی علم نہیں اور یہ تمام ایجابی صفات سے محروم ہے تو پھر بارکلے بتلاتا ہے کہ یہ مفروضہ محض الفاظ کا مجموعہ بن جاتا ہے جو شرمندۂ معنے نہیں ہوتا۔ ایسی شئے جو نہ مدرک ہے نہ مدرک، جو نہ امتداد رکھتی ہے اور نہ رنگ و بو، نہ ہی کوئی صفاتِ حسیہ، جو نہ فعال ہے نہ غیر فعال، علت ہے نہ معلول، جس کے صاف و واضح کیا معنے بلکہ جس کا کوئی دھندلا سا تصور بھی ذہن میں نہیں پیدا ہوتا، تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ شئے موجود نہیں بلکہ یہ کہ آپ ایسا اسم بول رہے ہیں جس کا کوئی مسمّیٰ نہیں، ایک ایسا لفظ استعمال کر رہے ہیں جس کا نہ کوئی معنے ہے اور نہ مفہوم" بلکہ محض لفظی گورکھ دھندا ہے[۱]۔ یہ الفاظ دیگر مادے کو غیر معلوم کہنا تضاد لفظی کا مرتکب ہونا ہے، کیونکہ اگر درحقیقت وہ غیر معلوم ہے تو ہم یہ کہہ سکتے کہ یہ مادی یا غیر شعوری شئے ہے۔ ایسے فلسفے کی کھیتی تو پکتی نظر نہیں آتی۔ برکلے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "مادہ لاشئے ہے[۲]"۔

غرض یہ ہے کہ بارکلے کا سارا استدلال جس کی تفصیل میں ہم نے کسی قدر طوالت سے کام لیا۔ لیکن اس اہم استدلال کو پوری طرح ذہن نشین کرنے کے لئے یہ طوالت بھی دراصل انتصار ہی ہے طوالت نہیں۔ اب ہم اوپر کے بیان کی تلخیص ان چند لفظوں میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں

(۱) دلیل اضافیت و دلیل مطالعہ باطن کی رو سے بارکلے نے یہ ثابت کیا کہ جن اشیاء کا ہمیں براہ راست و بدیہی طور پر ادراک ہو رہا ہے وہ تصورات ہیں جو ذہن سے مستقل و غیر محتاج طور پہ اپنا وجود نہیں رکھتے اس کے بعد اعتراضات کے جواب کی شکل میں اس نے مادے کے تین تعقلات کا امتحان کیا جن کی رو سے مادہ ایسی حقیقت ہے جس کا براہ راست ادراک تو نہیں ہم سکتا

---

[۱] مکالمات مترجمہ عبدالماجد صفحہ (۹، ۸۰) [۲] مکالمات مترجمہ عبدالماجد صفحہ (۹، ۸۰)

لیکن بہ حیثیت حقیقت منتجہ اس کا وجود مانا جاسکتا ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ

(۲) مادی اشیاء کو تصورات کے مشابہ و مماثل موجودات نہیں مانا جاسکتا

(۳) دعوے کیا کہ مادہ بہ حیثیت علتِ تصورات حواس موجود نہیں مانا جاسکتا۔ برکلے کے اس دعوے کو اس کے اصولی استدلال کی بنا پر ثابت کیا جاسکتا ہے

(۴) ثابت کیا کہ کسی مطلقاً غیر معلوم مادی حقیقت کا وجود محض اختراعِ ذہنی ہے، محض لفظی گورکھ دھندا ہے۔

اس طرح برطانیہ عظمے کے اس لبیبِ اعظم نے، اپنے خیال میں، مادیت کے پرستاروں کو ہمیشہ کے لیے شکست دی۔ زمانۂ حال کے "حقیقت پسند" مفکرین نے ان بے پناہ براہین کو کس طرح توڑا اس کا قصہ ہم تمہیں بعد میں چل کر سنائیں گے جو شاید تمہاری دلچسپی کا باعث ہوگا۔

بارکلے کے اس عظیم الشان استدلال کی تکمیل کے لیے ہمیں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ حقیقت والتباس کا فرق بتلاتے ہوئے بارکلے نے تصوراتِ حواس (جن کو عام طور پر اشیائے خارجی کہا جاتا ہے) کی علت خدا یا روح نامتناہی کو قرار دیا تھا اور تصورات "تخیل" کی علت محدود و متناہی ذات کو۔ اس طرح بارکلے کی تصوریت کی رو سے کائنات ارواح متناہیہ و روح نامتناہی پر مشتمل قرار پاتی ہے جس میں مادے کا سرے سے وجود نہیں۔ خدا کے وجود کو ماننے کی وجہ سے برکلے کی ذہنی تصوریت محض ایجابیت و اسمیت ہونے سے بچ جاتی ہے۔ اور ارواح متناہیہ کو تسلیم کرنے وہ "ہمہ منم" کا نظریہ نہیں بن جاتی۔ اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہ بتلائیں گے کہ بارکلے وجود باری کا کیا ثبوت دیتا ہے۔

مبادی علم انسانی کے بند ۲۸-۲۹ میں بارکلے اس ثبوت کو پیش کرتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

مجھے اپنے تصوراتِ حواس کا براہِ راست و بدیہی طور پر ادراک و یقین ہوتا ہے۔ (یہ میری مرضی کے تابع نہیں، بلکہ میرے ارادے کے خلاف مجھ پر عاید ہوتے ہیں مثلاً جب میں دن میں آنکھیں کھولتا ہوں تو خواہی نخواہی مجھے چیزیں نظر آتی ہیں۔ لہذا تصورات کی ایک علت ہونی چاہیئے۔

تصورات حواس کی صرف تین علل ہو سکتی ہیں (۱) روح یا ارواح (۲) تصور (۳) مادہ، لیکن بارکلے نے یہ ثابت کیا ہے کہ مادے کا تو وجود ہی نہیں لہذا وہ تصورات حواس کی علت نہیں ہو سکتا اور تصورات ایک دوسرے کی علت نہیں ہو سکتے کیونکہ بارکلے کی رائے میں یہ منفعل نہیں یعنی اپنے وجود میں کسی ذات کے علم کے محتاج ہیں، لہذا روح یا ارواح ہی تصورات حواس کی علت ہو سکتی ہیں۔

اس نتیجے کی تائید مجھے اپنے اس بدیہی تجربے سے ہوتی ہے کہ میں روح ہونے کی حیثیت سے تصورات پیدا کر سکتا ہوں اور ان کی علت بن سکتا ہوں

لیکن مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ میں بہ حیثیت روح ہونے کے تصورات حواس کی علت نہیں ہوں کیونکہ یہ میری مرضی کے خلاف مجھ پر عاید ہوتے ہیں

لہذا دوسری روح جو مجھ سے علیحدہ ہے ان کی علت ہونے کی حیثیت سے موجود ہونی چاہیئے اور اسی روح کو خدا کہتے ہیں۔ یہ روح خلاقِ ازلی و ابدی ہے کیونکہ اس کے سرمدی ہونے کی وجہ سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس طرح ارتسامات حواس کا وجود باقی رہ سکتا ہے اور کس طرح وہ تمام نفوس مدرکہ سے غیر محتاج ہے۔

بہرحال وجود باری کی دلیل بارکلے کے نزدیک یہی ہے کہ تصوراتِ حواس جو میرے ذہن پر منقش ہوتے ہیں اور جو میرے ارادے کے محتاج نہیں ایک روح ازلی کے پیدا کردہ ہیں جو خدا ہے۔ تصوراتِ حواس کی ماہیت پر غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان میں ایک مقصد و غایت بھی پائی جاتی ہے لہذا ان کی پیدا کرنے والی روح بھی عقل و حکمت سے متصف ہوگی۔ اس طرح بارکلے ایک ہمہ داں ہمہ تواں یا قادرِ مطلق خدا کے وجود کو ثابت کرتا ہے اور اپنی تصوریت کو اس نظریے سے دور رکھتا ہے جس کو اصطلاح میں "نظریۂ ہمہ منم"

کہا جاتا ہے (اور جس کی رو سے میں اور میرے تصوّرات کے سوا کسی کا سرے سے وجود ہی نہیں) بارکلے کی تصوّریت ایک "روحانی کثرتیت" ہے جس کی رو سے کائنات خدا اور ارواحِ متناہیہ پر مشتمل ہے۔

~~~~~~~~~~~~

میر ولی الدین

ام اے، پی، ایچ، ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا
~~~~~~~~~~~~

چکبست کی قومی شاعری

کچھ اور ہے وہ شاعرِ معجز بیاں نہیں
جس کے سخن سے رنگِ طبیعت عیاں نہیں

قومی شاعری کے معماروں میں چکبست کو خاص اہمیت حاصل ہے اگرچہ اُن کی ایک ایسے ماحول میں پرورش ہوئی جہاں گُل و بلبل کے لاطائل افسانے، حُسن و عشق کی ہرزہ سرائیاں، شہبازِ تخیل کی فلک پیمائیاں، مئے دوآتشہ کی کیف سامانیاں، اور "جب چھم سے چلیں، گود میں چپکے سے اُٹھا لو" کے بے کیف نغمے لحنِ داؤدی کی طرح وجد آفریں سمجھے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ابتدائی شاعری میں نرم و گرم غزلیں ملیں گی، جس میں آپ وہ خصوصیات پائیں گے جو میرؔ، مومنؔ اور غالبؔ کو متقدمین اور متاخرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ تاہم جو سرمایہ بھی اُن کی یادگار ہے ناقابلِ اعتنا نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ وہ بالکلیہ قدیم اساتذۂ سخن کے تابع مہمل یا ضمیمہ ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ اُن کی فطری جولانیاں اور رائج قدیم اسلوب میں بھی قابلِ لحاظ جدت طرازی کی ضامن ہیں۔ خود کہتے ہیں :۔

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

اقبالؔ کے قومی ترانوں سے متاثر ہو کر ۱۹۰۵ء میں چکبست نے قومی شاعری کو اپنے

توسنِ طبع کی جولاں گاہ قرار دیا، لیکن اِس کی نشو و نما اُس پُر آشوب زمانے میں ہوئی جب کہ جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے باعث ربع مسکوں میں ہیجان اور انتشار پھیلا ہوا تھا اور دُنیا کے سیاسی نقشے سے اکثر ریاستیں غائب ہو رہی تھیں ہندوستان بھی ان انقلابات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اہلِ ہند میں ذہنی بیداری کی برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اُن کے بے حس دلوں میں سیاسی آزادی کی ترنگ پیدا ہوئی اور وہ غلامی کی جکڑ بندیوں سے مخلصی پانے کے لیے اُس نو گرفتار پرندے کی طرح جدو جہد کرنے لگے جو غفلت سے اسیرِ دام ہو گیا ہو، چنانچہ تحریکِ ترکِ موالات، ہمہ اسلامیت، کانگریس، مُسلم لیگ، ہندو سبھا اور خلافت وغیرہ اسی انقلاب آفریں دور کی پیدا وار ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو پہلی مرتبہ اسی زمانے میں محسوس کیا گیا جس کو قومیت کا نقطۂ آغاز کہنا چاہیئے۔

چکبستؔ کا کلام ان تمام تحریکوں اور قوتوں کا آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ سچّا شاعر قوم کی آنکھ اور ترجمانِ حقیقت ہوتا ہے۔ وہ ماحول سے اکتسابِ الہام کرتا ہے۔ اُس کے جوش انگیز ترانے، نوجوان مُحبّانِ وطن میں سر فروشی، اور جاں بازی کے ولولے پیدا کرتے ہیں، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قومی شاعری ایک برقی رو ہے۔ جو مُردہ جذبات کو گرماتی ہے۔ سوئے احساس کو جگاتی ہے۔ احساسِ پستی کو مٹاتی ہے، رگِ حمیت کو جوش میں لاتی ہے اور مُلک کے ہونہاروں کے قلوب میں عزتِ نفس، خود اعتمادی اور حبُ الوطنی کے بیج بوتی ہے۔

چکبستؔ نے محسوس کیا کہ قوم میں احساسِ آزادی پیدا کرنے اور اُس کو غلامی کی ذِلت سے باہر نکالنے کا شاعری سے بہتر کوئی اور آلہ نہیں ہے، اور اُن کا یہ خیال گندم نما جو فروش رہنمایانِ ملّت کے عزائم کی طرح خیال ہی تک محدود نہیں رہا۔ اِس لیے کہ بے لوث جذبات دل کی چار دیواری میں محبوس نہیں رہتے۔ اگرچہ زمانہ استبداد پسند تھا۔ ساری آزادیاں مقراضِ احتساب میں تھیں۔ بڑے بڑے وطن پرست، سوسن کی طرح لب گفتار سے محروم تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی باکمال بت تراش نے اپنی تمام صنعت کارانہ قابلیتوں کو ہزار گونہ سخن در دہان د

لب خاموش" کی تصویری تعبیر میں بہ احسن الوجوہ صرف کیا ہے۔ ایسی صورت میں بےچارہ شاعر کس شمار وقطار میں آسکتا ہے۔ مگر خاکسارانِ جہاں کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ آگ کی ذرا سی چنگاری، گو بظاہر معمولی و حقیر سہی، لیکن اُس میں وہ ساری غضب ناک قوتیں مستور ہوتی ہیں جو چشم زدن میں خس و خاشاک کے بلند و بالا ڈھیر کو جلا کر خاکستر کرسکتی ہیں۔ شاعر کے کلام کو بھی قدرت نے وہ سوز وگداز اور سحر آفرینی بخشی ہے جس سے قوم کے اُجڑے ہوئے چمن میں بہار آتی ہے اور اپنی ساری رعنائیوں اور کیف سامانیوں سے اُس کو جنت نظر بناتی ہے۔ البتہ وقت کی نزاکت مقتضی تھی کہ بے پناہ جذبات کو تلمیح اور استعارے کے پردے میں ہمدردانِ قوم تک پہنچایا جائے۔ مولانا حالی کا یہی اصول تھا۔ چکبست نے بھی اسی طریقے کو پیشِ نظر رکھا۔ ذیل کے اشعار کو اسی اصول کی صدائے بازگشت کہنا چاہیئے جس میں شاعر نے زبان بندی کے حکم کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس لطیف پیرائے میں کہ اس سے بہتر حسنِ بیان کا طریقہ شاید ہی ہو ؎

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں ~~~ چپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے
ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے ~~~ ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

اس کی وجہ بھی سُن لیجیے ؎

جو آج کل ہے محبت وطن کی عالمگیر ~~~ یہی گنہ ہے، یہی جرم ہے، یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پہنائی ہے زنجیر ~~~ بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دل میں درد مگر طاقت کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

چکبست اپنے ہموطنوں کی بےبسی اور بےچارگی سے ناواقف نہ تھے، لیکن اُن کو حیرت تھی کہ وہ باعظمت اور الوالعزم قوم جو چار دانگِ عالم میں کوس لمن الملکی بجا رہی تھی جس کی طاقت و قوت کی قہرمانی سے ایک دُنیا لرزہ براندام تھی، فلک سفلہ پرور کی ایک ہی گردش میں اپنے تمام صفاتِ عالیہ سے کچھ اس طرح محروم ہوگئی کہ گویا اُس کا اپنا تابناک ماضی ہی نہ تھا۔ یہ انقلاب حیرت افروز بھی تھا اور اندوہ فزا بھی۔ دیکھیے کس مایوسانہ انداز میں بےبسی کا اظہار کیا ہے ؎

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اُس کے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے
یہ بے کسی بھی عجب بے کسی ہے دُنیا میں — کوئی ستائے ہمیں، ہم ستا نہیں سکتے

مگر "آزادی" ایسا لفظ نہیں جو شرمندۂ معنے نہ ہوا ہو۔ یہ وہ نقشِ سلیمانی ہے جو نفاق و افتراق کو مٹا کر اتحاد و یکجہتی کی طرح ڈالتا ہے۔ ڈھئی ہوئی ہمتوں کو اُکساتا ہے اور خوابیدہ آرزوؤں کو جگاتا ہے۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے قفس کی تیلیاں مقید پرندوں کو نہیں بھاتیں محکوم قوم کے پہلو میں بھی دل ہوتا ہے، اور دل پیالہ و ساغر نہیں، بلکہ بے شمار اُمنگوں کا گنجینہ ہے۔ کیا وہ اغیار کی دراز دستیوں اور روح فرسا ستم آراؤں کے آگے سرِ اطاعت خم کر دے گی؟ مثل مشہور ہے "تنگ آمد بہ جنگ آمد" پیہم مصیبتیں انسان کو دلیر اور جانباز بنا دیتی ہیں۔ زبان بندی قوم کے سچے پرستاروں کے لیے حوصلہ شکن نہیں ہوتی اور نہ اُن کے پائے استقلال کی لغزش کا باعث ہوتی ہے اِس لیے کہ زندان کی بلند و بالا دیواریں، حلقۂ زنجیر کی جکڑ بندیاں اور دار و رسن کی مضبوط بندشیں پیکرِ آب و گِل کو مقید کر سکتی ہیں، لیکن دُنیا کی کوئی طاقت خیال کی پہنائی کو محیط نہیں کر سکتی۔ روح کے ولولے ہمیشہ آزاد ہی رہتے ہیں، مگر یاد رہے کہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو صورتوں میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے استقلال ضروری ہے کیوں کہ لاجنب ارادے اور اٹل منصوبے ہی پایان کار صورت پذیر ہوتے ہیں، بہ قول اقبال ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

شاعر، قوم کا سچا بہی خواہ اور بے لوث نمایندہ ہے۔ اُس کی آواز قوم کی آواز ہے۔ انقلابِ فرنگ اُس کا ادنیٰ کرشمہ ہے جس کے ثبوت میں مغربی قوموں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جذباتِ حریت کے تلاطم نے چکبست کے دل کو سیمابی کیفیات سے معمور کر دیا تھا جس کو وہ سینہ چیر کر وقفِ تماشا کرنا چاہتے تھے۔ اس پر سیاسی ہنگامہ آرائیوں نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اور ابھی سرمدی نیند کے متوالے حالی کی پیہم تلخ نوائیوں سے خواب و بیداری کے سے عالم میں تھے کہ چکبست کی یہ جرأت آفریں صدا سامعہ نواز ہوئی ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

اب ذرا اُس وارفتۂ آزادی چکبست کی تصویر دیکھیے جو ہر قسم کے مصائب اور تکالیف کو

خندہ پیشانی سے برداشت کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا، اور جوش میں یہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

ہو چکی قوم کے ماتم میں بہت سینہ زنی — اب ہو اس رنگ کا سنیاس یہ ہے دل میں ٹھنی
مادرِ ہند کی تصویر ہو سینے پہ بنی — بیڑیاں پیر میں ہوں اور گلے میں کفنی

ہو یہ صورت سے عیاں عاشقِ آزادی ہیں
قفل ہے جس کی زباں پر یہ وہ فریادی ہیں

اور اپنے مستقل ارادے کو اس طرح سناتے ہیں ؎

آج سے شوقِ وفا کا یہی جوہر ہوگا — فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائے گا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا — قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا

سنتری دیکھ کر اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

الحاصل قوم میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے تو آزادیاں کہاں تھیں؟ ملک وسلطنت اغیار کے پنجۂ آہنی میں تھے، مگر پرستارانِ حرّیت نے ہمت نہ ہاری۔ خوف وہراس کو پاس تک پھٹکنے نہ دیا اور ناکامی کے خیال کو تارِ عنکبوت سے زیادہ اہمیت نہ دی اور کیا ہندو کیا مسلمان دونوں نے رستخیز بے جا کے خلاف علمِ احتجاج بلند کیا اور آزادی کی قربان گاہ پر جان ومال کی بھینٹ چڑھا دی۔ قوم کا یہ عزم امید افزا اور ایک رفیع الشان مستقبل کا پیش خیمہ تھا۔ چکبست کی بھی یہی آرزو تھی کہ اُن کے ہموطن نشۂ حرّیت سے سرشار ہوں اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر صرف حصولِ آزادی کو مقصدِ حیات قرار دیں۔ شاعر کی پُرخلوص امیدوں اور اُس کے ہموطنوں کے جوش وخروش کی جھلکیاں ذیل کے بند میں دیکھیے ؎

نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی — ہے جس سے شیخ وبرہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی — چلے ہیں بہرِ زیارت وفا کے سودائی

وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے اُفق سے نیا آفتاب نکلا ہے

اپنی قوم میں وطن پرستی کی یہ شدت اور ہنگامہ آفرینیاں دیکھ کر چکبست کے تنِ مُردہ میں

جان آگئی، جذبۂ عمل کی شعلہ سامانیوں نے اکسایا اور وہ وفورِ جوش میں پکار اُٹھے کہ بانیانِ استبداد ہوشیار ہو جائیں، اس لیے کہ قوم کے سُورماؤں نے انتقام لینے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ زبان بندی کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ آزادی بنی نوع انسان کا فطری حق ہے اور جذبۂ حرّیت کی مثال اُس طوفان خیز دریا کی سی ہے جس کے بہاؤ کو روکنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ شاعر، قوم کے پُرجوش ارادے کو اس طرح الفاظ کا جامہ پہناتا ہے ؎

حکم حاکم کا ہے فریادِ زبانی رُک جائے　　دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رُک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رُک جائے　　پر یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رُک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

لیکن، انھوں نے جلد ہی محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے عزائم اور بھاری بھرکم دعوے سوڈا واٹر کا اُبال ہیں، اُن کے احساسات میں گہرائی اور ارادوں میں صفائی نہیں ہے کیوں کہ تھوڑے ہی عرصے میں ساری سیاسی تحریکیں نقش برآب اور باد رہوا ثابت ہوئیں۔ مگر مولانا حالی کی طرح وہ قنوطی جذبات سے مغلوب ہونے والے نہ تھے۔ بیم و رجا کی کشاکش سے زندگی مستقل آزار بن جاتی ہے، لیکن اُن کے نزدیک اُمید ہی زندگی کا سہارا تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ وطن کے اختلافات اُن کو ایک درخشندہ مستقبل کے تصوّر سے مایوس نہیں کرتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

نہ بدلی ہے، نہ بدلے گی ترنگ اپنی طبیعت کی　　دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

علاوہ ازیں وہ جانتے تھے کہ انقلاب آفرینی فطرت کا اٹل قانون ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوامِ عالم کی زندگی میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دورِ حاضر کی آزاد اور متمدن قوموں کو بھی محکومیت کے نشیب و فراز سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ لہٰذا انھوں نے قوم پرستوں کی ناکامی کے اسباب و علل پر غور کرنا شروع کیا۔ وطن کے مہتم بالشان ماضی پر طائرانہ نظر ڈالی اور حال سے اُس کا موازنہ کیا تو بہ ظاہر "خاکِ ہند" کی عظمت میں کوئی نمایاں فرق نہ پایا۔ اس لیے کہ صنّاعِ اعظم کی صنعت کاریوں نے اُس کے چپے چپے کو رشکِ فردوس بنایا ہے وہی

سر بہ فلک پہاڑ ہیں۔ وہی دل فریب آبشار ہیں۔ وہی جھیلیں ہیں اور وہی دریا۔ وہی سرسبز و شاداب جنگل ہیں اور ہرے بھرے مرغزار جن میں طاؤس رقص کرتے ہیں پپیہے "پی کہاں" کا دلدوز نغمہ الاپتے ہیں۔ کوئل اپنی رس بھری آواز سے سرمدی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ چمن زاروں کی وہی بوقلموں جلوہ سامانیاں ہیں جو گلاب، نرگس، نسترن، کیوڑا، سیوتی، چنبیلی، موتیا، سورج مکھی اور لالہ کی بہاریں یاد دلاتی ہیں۔ نیز رنگ برنگی پرندے بھانت بھانت کی بولیوں اور پُرکیف زمزمہ پردازیوں سے فرحت آفریں مناظر کو سرچشمۂ موسیقی بناتے ہیں، غرض کہ کائناتِ حُسن کی وہی سحر کاریاں اور دلاویزیاں تھیں جو آغازِ گیتی سے اس وقت تک "خاکِ ہند" کے لیے طغرائے امتیاز رہی ہیں اور کیوں نہ باقی رہیں ؎

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سورَ بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

اس ضمن میں انھوں نے سرسری طور پر قوم کا جائزہ بھی لیا۔ "جوئندہ یابندہ" کوئی نئی مثل نہیں پھر "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے"۔ واقعات و حالات کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بہ حیثیت مجموعی اُس میں اسلاف کی ساری خصوصیتیں تو ہیں لیکن فقدان ہے اُس ہنگامہ آفریں جوش کا جو بقائے حُرّیتِ قوم کے لیے لابدی ہے یعنے ؎

گل شمع انجمن ہے، گو انجمن وہی ہے　　حُبِ وطن نہیں ہے، خاکِ وطن وہی ہے

ذیل کا قطعہ شاعر کے مافی الضمیر کا آئینہ ہے جس میں اُس نے قومی ادبار کے راز کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے ؎

کبھی تھا ناز زمانے کو اپنے ہند پہ بھی　　پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں
رگوں میں خون ہے وہی، دل وہی، جگر ہے وہی　　وہی زباں ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں
وہی ہے بزم، وہی شمع ہے، وہی فانوس　　فدائے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں

وہی ہوا، وہی کوئل، وہی پپیہا ہے وہی چمن ہے، پہ وہ باغباں چمن میں نہیں
غرور و جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

مشرقی قوموں میں نفاق و شقاق ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ حبشیوں کی حالیہ شکست کا ایک بڑا سبب یہی اختلافات ہیں۔ انفرادیت، قومیت کے تخیل کو بار آور نہیں ہونے دیتی مگر اس بدقسمتی کو کیا کیا جائے کہ یہاں افراد کا مقصدِ حیات انبساطِ نفس ہے اور یہی وجہ ہے کہ حسد و تکبر اُن کے خمیر کا جزو اعظم ہیں اور وہ اپنے اقران و امثال کی معمولی سی کامیابی کو بھی بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھ سکتے۔ انانیت و رعونت کا بھوت اُن کے سروں پر سوار رہتا ہے۔ طبیعت کی جنوں جولانیاں اور وحشت سامانیاں ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے پر اکساتی ہیں اور یہی نفاق انگیزیاں بالآخر قومی اتحاد و یکجہتی اور محبت و موانست میں رخنہ انداز ہوتی ہیں۔ حالانکہ افراد کی سرفروشی، وطن دوستی اور ایثار سے قومی وقار و عظمت کے قصر کی تعمیر ہوتی ہے۔ شاعر کی پیش قیاسی ملاحظہ ہو ؎

اپنے اپنے راگ سے کان آشنا ہونے کو ہیں پردہ ہائے سازِ قومی بے صدا ہونے کو ہیں
رہنمائی کس کی ہوگی مجھ کو حیرت ہے یہی قافلے میں قوم کے سب پیشوا ہونے کو ہیں
جذبۂ خدمت، صفائے قلب، آئینِ ادب خود نمائی پر یہ سب جوہر فدا ہونے کو ہیں
جن کو منزل سے زیادہ ہو ہوا کا رُخ عزیز قوم کے بیڑے کے ایسے ناخدا ہونے کو ہیں

پھر پیغمبرانہ تیقن سے کہتے ہیں ؎

گر یہی ہے گردشِ دوراں کا رنگِ انقلاب ہوش اُڑ جائیں گے وہ فتنے بپا ہونے کو ہیں

اور اسی نفسی نفسی کی بدولت غدر کے بعد سے آج تک خاکِ ہند کو مشترکہ محاذ پیش کرنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ جس قوم کے رہنماؤں اور مصلحوں میں مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور قوم کی خدمت گذاری کے پردے میں جلبِ منفعت کے خواستگار ہوں اُس کے نخلِ تمنّا کا ثمر آور ہونا معلوم۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ؎

دکھلاتی ہے بس سیفِ زباں جوہرِ عالی لاریب صدا دیتا ہے جو ظرف ہے خالی

اصلاح کی تقلید ہے یہ امرِ خیالی
جب بانیٔ اصلاح ہوں خود ضیغم قالی
گر حُسن نہیں عشق بھی پیدا نہیں ہوتا
بلبل گُلِ تصویر پہ شیدا نہیں ہوتا

کہنے دیجیے کہ سرزمینِ شرق، وطن پرستی اور ملت نوازی کے لیے سازگار نہیں ہے، مگر دوسری قوموں سے قطع نظر یہاں مجملاً اُن واقعات اور حالات کی طرف اشارہ کیا جاسے گا جو ہندوستانیوں میں اختلافات کا باعث ہوئے۔

ہے یہ کہ ہندوستان ان گنت قوموں کا جنم بھوم ہے جن کی زبانیں، معاشرت اور تمدن ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ اُس پر طرفہ تماشا یہ کہ تعصب و تنگ نظری کی وبا ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے کہ تعصب تمام بُرائیوں اور خرابیوں کی جڑ ہے۔ بالخصوص جب کسی قوم کے افراد شومیٔ قسمت سے اس منحوس اور نامسعود جذبے کا شکار ہو جاتے ہیں تو پھر ارضِ وطن محشر بن جاتی ہے! ور بہ ایں ہمہ وسعت اُن کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ مغرب، اختلافِ عقاید کے باوجود فرقہ پرستی کے الجھیڑوں اور عافیت سوز جھمیلوں میں پھنس کر شیرازۂ قومیت کو پراگندہ نہیں کرتے۔ اسی بنا پر شاعر مُدبّرینِ یورپ کے ایثار اور وطن پرستی کا ثنا خواں تھا، اور رہتا کیوں نہیں کہ ؎

تھے خطۂ یورپ میں جو اصلاح کے بانی
آزادیٔ قومی پہ لہو کر گئے پانی
مرجھا گئے کتنے ہی گُلِ باغِ جوانی
اس نخل سے پر دور رہا رنگِ خزانی
سرگرمِ شہادت تھے وہ ایثار کی خُو سے
سینچا چمنِ قوم رگِ جاں کے لہو سے

پھر اُن کے عزم بالجزم کی اس طرح مدح سرائی کرتے ہیں ؎

تھے یکہ و تنہا پہ ہزاروں کو نہ سمجھا
عشقِ گُلِ مقصود میں کانٹوں کو نہ سمجھا
سر کٹ گئے تلواروں کی دھاروں کو نہ سمجھا
جل جل گئے شعلوں کو شراروں کو نہ سمجھا
بدکیش نمود اُن کی مٹا اب نہیں سکتے
وہ آگ لگی ہے کہ بجھا اب نہیں سکتے

اگرچہ اُس وقت اہلِ ہند میں ذہنی بیداری کے آثار شباب پر تھے۔ سیاسی آزادی اُن کا منتہائے نصب العین تھا۔ اُن میں ہنگامہ آفریں جوش و خروش کی کمی تھی اور نہ بے لوث خدمت گذاروں کی، جو بہ ظاہر رواداری، باہمی استعانت، اخوت و یگانگت کے زبردست حامی تھے، اور بجائے فرقہ پرستی، قومیت کے پرچار کو کلیدِ آزادی سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود اُن کی کوششیں مشکور نہیں ہوئی تھیں، جیساکہ غالب نے کہا ہے ؎

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

علم بردارانِ حریت کی بلند آہنگ زمزمہ پردازیوں کا راز شاعر کی زبانی سُنیے جس کی قوتِ متخیلہ آئینہ "امروز" میں "احوالِ فردا" منعکس پاتی ہے اور وہ علی الاعلان پکار اُٹھتا ہے ؎

زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا — اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

بہت پنہاں رہی دل میں خلش خارِ تعصب کی — مگر اب امتحاں کے وقت پردا ہو نہیں سکتا

جُدا سینے سے دل ہو دست و بازو قوم کے شل ہوں — مگر دل سے جُدا دم بھر یہ کانٹا ہو نہیں سکتا

گراں ہے جنس اور نیت خریداروں کی ابتر ہے — اب اس بازار میں اُلفت کا سودا ہو نہیں سکتا

جنسِ اُلفت کی گراں مایگی اور نیت کی ابتری تعصب ہی کی گلکاریاں ہیں اور یہی کوتاہ اندیشیاں بے رت کی ہولی ڈھلنڈی کی طرح سارے آلام اور قومی ادبار و ذلت و نکبت کا باعث ہیں۔ اگرچہ ماحول سے متاثر ہوکر چکبست نے بھی اپنے فرقے کی ہمنوائی کی تھی اور ہندو مُسلم کشیدگی اور نفاق و انشقاق کا الزام مسلمانوں پر لگایا تھا جیساکہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ؎

اذاں سے نغرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا — ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

ایسا کہنے پر وہ مجبور بھی تھے، کیوں کہ اپنے فرقے اور جماعت کے معاملے میں قومیت کے قوی آہنگ نقیب بھی ذاتی احساسات کی پردہ پوشی نہیں کرسکتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو ملکی حالات اور باہمی دراندازیوں کے عبرت انگیز واقعات سے اُن کے خیالات میں انقلاب عظیم ہوا، اور انھوں نے متحدہ قومیت کو آزادیٔ وطن کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہ ایک خوش آیند خواب تھا جس کی تعبیر میں اُلجھنیں پڑ رہی تھیں، اس لیے کہ

ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی حسنِ سلوک، رواداری اور جوشِ الفت کی اگلی سی گرم بازاری نہ تھی۔ انفرادیت اور فرقہ پرستی کا جنون عام تھا۔ زمانہ دیدہ بزرگوں میں بھی چشمِ بصیرت مفقود تھی۔ نوجوان جو قوم کے دست و بازو ہیں، قومی کشتی کے ملاح ہیں اور ایوانِ قومیت کے ستون ہیں، لہو و لعب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ زمانے کی نیرنگیاں اُن کے لیے سبق آموز اور عبرت فزا نہ تھیں، اور اُن کا خیال تھا کہ ؎

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب — وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے
جنونِ حبِّ وطن کا مزا شباب میں ہے — لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

مگر جب صورتِ حال اس کے برعکس نہایت خراب اور افسوسناک ہو تو بہی خواہانِ قوم کی تشویش کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ چکبست بہ صد حسرت و یاس کہتے ہیں ؎

گلشنِ قوم میں ہے بوشِ نظر رنگ عجیب — فتنے جاگے ہوئے ہیں خوابِ گراں میں ہیں نصیب
دل محبت سے خفا ہیں تو مروت کے رقیب — دور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں ہر وقت قریب

اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں!!
دل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں!!

ان باہمی تنازعات کے پردے میں دراندازی اور غرض آشنا مذہبی رہنماؤں کی خبیث طینت کارفرما تھی جو اختلافاتِ عقاید کو وجہ مخاصمت و جدال و قتال بنا رہے تھے۔ حساس دلوں کو اس کا سخت صدمہ تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ سرزمینِ وطن کو خانہ جنگیوں کا مرکز بنائیں۔ اس افسوسناک ذہنیت پر چکبست خاموش نہ رہ سکے اور سوزِ الفت سے تڑپ کر پکار اُٹھے ؎

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں — وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے — دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں
اذاں دیتے ہیں بتخانے میں جا کر شانِ مومن سے — حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم آئین وفاشعاری، یکجہتی اور ہم آہنگی کے احیاء کا متمنی تھا اور یہ خیال مذکورہ معاندانہ ذہنیت کے استیصال کے بغیر

صورت پذیر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے لیے ایک صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ مختلف مذاہب کی صحیح تعلیمات سے عامۃ الناس کو روشناس کرایا جائے اور بلا امتیاز مذہب و ملت ایک دوسرے کے پیغمبروں اور رشیوں کے آداب و احترام کی تلقین کی جائے۔ لیکن اس بارے میں چکبست کا یہ نظریہ تھا کہ ؎

واجب نہیں مذہب کے مسائل میں بھی حجت | بازیچۂ اطفال ہیں ہفتاد و دو ملت

بس قابلِ تسلیم اُسی کی ہے شریعت | جس دل میں ہو انساں کے لیے دردِ محبت

تہذیب پسند دیدۂ آفاق یہی ہے

مذہب یہی ملت یہی اخلاق یہی ہے

اور دوسری صورت یہ تھی کہ فرقہ پرستوں کو بادۂ حُب الوطنی سے لذت اندوز کیا جائے تاکہ وطنیت کے فیوض و برکات اُن کو ملت کی عافیت سوزیوں سے متنفر کر دیں۔ اور یہ ممکن بھی تھا، کیوں کہ اپنے مرز بوم سے عشق و اُلفت اقتضائے فطرت ہے۔ چکبست بھی وطن کی محبت کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ خارِ وطن کو سنبل و ریحاں سے "خوش تر" مانتے تھے۔ اُن کے کاشانۂ دل پر قومی اُلفت کا چراغ روشن تھا، اس لیے اُن کو کامل یقین تھا کہ صرف آخر الذکر صورت سے باہمی مناقشات کی جڑ کٹ سکتی ہے، اور سارے اختلافات دُور ہوسکتے ہیں۔ پس وہ سرخوشی اور وجدانی عالم میں التجا کرتے ہیں ؎

اے صُورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے | بھُولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے

مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے | اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نُور ہو کر

سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

لیکن وطن پرستی کا یہ جوش و خروش بناوٹی اور رسمی نہ تھا۔ وہ قوم کے رنج و غم اور خوشی و مسرت میں برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ جنوبی آفریقہ میں غریب الوطن ہندوستانیوں پر جب ناروا ظلم و ستم ہونے لگے تو ان کو بھی سخت قلق ہوا، کیوں کہ کیا ہندو، کیا مسلمان دونوں استبدادیت کے شکار تھے۔ شاعر نے پردیس میں ابنائے وطن کی زبوں حالی

اور تیرہ بختی کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

وطن سے دُور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی | اسیرِ یاس بھی ہیں اور اسیرِ زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی | ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہُو کی گنگا میں

اس بے بسی اور بے چارگی کے اظہار سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ درد مندانِ قوم کسی صورت سے اُن کی اعانت و امداد کریں تاکہ اُن کی زندگی سہل ہو اور وہ آرام و آسادگی سے گذر بسر کریں اور قومی وقار و عظمت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگے۔ وہ پہلے ہندوؤں سے مخاطب ہوتے ہیں اور دُور افتادگان قوم کی حالت کس مپرسی پر آنسو بہاتے ہیں، اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر اب بھی اعانت نہ کی گئی تو اُن کی کشتیٔ حیات بحرِ عدم کے بے ہنگام تھپیڑوں سے برباد ہو جائے گی۔ شاعر کے اسلوب بیان کی دل نشینی اور اثر آفرینی ملاحظہ ہو ؎

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار | اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار | تو زیرِ موجِ فنا ہوگا آبرو کا مزار

مٹے گی قوم، یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

بعد کو وہ مسلمانوں سے التجا کرتے ہیں اور اس موثر انداز میں کہ سنگ دل ترین انسان بھی پسیج جائے اور جرأت و پامردی کا وہ درس دیتے ہیں کہ بُزدل بھی میدانِ جنگ میں کوُد پڑے ؎

دکھا دو جوہرِ اسلام اے مسلمانو | وقارِ قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدرِ قومیت جانو | جفا وطن پہ ہے فرضِ وفا کو پہچانو

نبیؐ کے خُلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم

پھر بامروت اسلاف کی حمیت کا واسطہ دے کر اُن کو اعانت پر آمادہ کرتے ہیں ؎

کرو خیال کچھ اسلاف کی محبت کا
دیا تھا دشمنِ قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا
یہ فرضِ عین ہے، تو دا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
"ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی"

اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ جُراءت آفریں باتوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جُوش دلاتے ہیں کہ اگر آج حکومت کی دار و گیر سے مرعوب ہو کر تم نے چُوڑیاں پہن لیں، لبوں پر مُہر سکوت ثبت کر لی اور غلامی کا جُوا اتار پھینکنے کی کوشش نہ کی تو یاد رکھو، تاریخ تم کو ہمیشہ نفرت و حقارت سے یاد کرے گی اور آیندہ نسلیں لعنت و ملامت کریں گی۔ کہتے ہیں ؎

جو دب کے بیٹھ رہے سر اُٹھاؤ گے پھر کیا
عدو قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا و جور کی ذلت اُٹھاؤ گے پھر کیا
تم اپنے بچوں کو قصّے سناؤ گے پھر کیا

رہے گا قول یہی اُن سے اُن کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمہاری ہے بے حیاؤں کا

پھر کہتے ہیں کہ قوم کے دامنِ عزت پر بُزدلی کا دھبہ لگا کر عیش و سرور کی محفلیں گرمانا انتہائی بے حِسی اور پست ہمتی ہے، اور اس سے کہیں زیادہ مذموم جذبہ ذاتی نمود اور حصولِ جاہ و ثروت کی خواہش ہے جب کہ قوم کی گردن طوقِ غلامی سے گراں بار ہو ؎

مِٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جُوش کھائے جو عزت تو وہ لہُو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

اپنی التجاؤں کو بے اثر پا کر بالآخر وہ نہایت ہی مایوسانہ انداز میں کہتے ہیں ؎

اگر دلوں میں نہیں اب بھی جُوش غیرت کا
تو پڑھ دو فاتحہ قومی وقار و عزت کا

وفا کو پھونک دو ماتم کرو محبت کا　　　جنازہ لے کے چلو قوم و دین و ملت کا

نشاں مٹا دو امنگوں کا اور ارادوں کا

لہو میں غرق سفینہ کرو مرادوں کا

پیہم ناکامیاں، رجائیت پسندوں کو بھی قنوطیت کی طرف مائل کر دیتی ہیں اور ان ہمت شکن حالات کے مدِ نظر چکبست کا اپنی قوم کے مستقبل سے مایوس ہو جانا اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے ممکنہ طریقے اختیار کیے۔ لیکن تعصب و تنگ نظری کا طلسم کچھ اس طرح چھایا ہوا تھا کہ کوئی افسوں کارگر نہ ہوا جس سے اُن کے قلب پر نہایت مایوسانہ اثرات مُرتسم ہوئے اور انھوں نے حسرت بھرے انداز میں افرادِ قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

چمن کو دیدۂ عبرت سے دیکھ اے بلبل　　　گلوں سے پھوٹ کے رنگِ خزاں نکل آیا

ازل کے دن جو تباہی کی فال دیکھی تھی　　　تو نام کشورِ ہندوستاں نکل آیا

یہ خیال ابھی دل میں گذرا ہی تھا کہ سروشِ غیب نے اُن کے کان میں چپکے سے کہہ دیا ؎

کمالِ بزدلی ہے پست ہونا اپنی نظروں میں　　　اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

اُبھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی　　　نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اس بصیرت افروز پیغام نے بارانِ رحمت کا کام کیا۔ اُن کے احساسِ خدمت گذاری میں ایک لہر دوڑ گئی، گویا سمندِ عمل پر تازیانہ لگا۔ مگر ساتھ ہی اُن کے مطمحِ نظر میں بنیادی تغیر بھی پیدا ہوا یعنے اس احساسِ پستی کے آغاز سے پہلے وہ آزادیٔ کامل کے علم بردار تھے تاکہ سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی پستی کے مُضر اثرات قوم میں سرایت نہ کرنے پائیں، اُن کا ایک مشہور شعر ہے ؎

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے　　　جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

مگر زمانے کے حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے حکومت کی پاس داری کو قرینِ مصلحت سمجھا۔ کہتے ہیں ؎

آب و دانے سے قفس کے کچھ ہمیں اُلفت نہیں　　　بے پر و بالی سے اپنی عاشقِ صیاد ہیں

یہی وجہ ہے کہ یا تو وہ قوم کے جذبات کو حکومت کے خلاف ابھار رہے تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے ؎

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے | نکلے ہیں لُوٹنے چمنِ روزگار کو

یا جب ہندوستانی افواج جنگِ عظیم میں شریک ہو کر حکومتِ برطانیہ کا حقِ نمک ادا کر رہی تھیں تو وہ کبیدہ خاطر نہیں ہوئے بلکہ اُن کے دل میں جوش اور جُرأت کا بے تھاہ سمندر موجزن ہوتا ہے کہ اُن کے ہم وطنوں کو شجاعت و شہامت کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا اور انھوں نے ایک عالمِ سرخوشی میں یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا ؎

ساحلِ ہند سے جرّارِ وطن جاتے ہیں | کچھ نئی شان سے جانبازِ کہن جاتے ہیں
رَن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں | تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

اپنے سپاہیوں کی بسالت و جاں بازی پر اس طرح فخر و مباہات کرتے ہیں ؎

ان کی رگ رگ میں بھرے ہیں شجاعت کے چلن | رن کا میدان ہے اُن کے لیے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت اُن کو ہے اک شب کی دُلہن | مر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن

جُوش ان میں جو ہے اس جُوش کا اب دَور نہیں
ساٹھ پشتوں سے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

اب وہ سپاہیوں کے جذبۂ حمیت کو اکساتے ہیں کہ اپنی شجاعت اور تیغ زنی کا اس طرح مظاہرہ کرو کہ مغرب کے سورماؤں کے دانت کھٹے ہو جائیں اور بتا دو کہ عرصۂ جنگ تُمھارے لیے ہُولی کی رُت ہے۔ کس تبختر سے فرماتے ہیں ؎

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا | طنطنۂ جرمنِ خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا | ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے

پھر کہتے ہیں ؎

تم کو اعزاز ملا ہے یہ وطن کا اعزاز　　دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمہاری انداز
خاکِ یورپ، یہ دلیری سے ہوا تم ممتاز　　تیغِ ہندی کی اصالت پہ زمانے کو ہو ناز

قوم کا اوج بڑھے، نامِ وطن زندہ ہو
روح پرتاب کی جنت میں نہ شرمندہ ہو

برطانوی حکومت کی تائید وحمایت محض خوش گوار اُمید کی بنا پر کی جا رہی تھی کہ شاید بیتے ہوئے عیش ونشاط کی گھڑیاں پھر میسر آجائیں، اور اس کا اُن کو کامل یقین بھی تھا ؎

اس خاکِ دل نشیں پہ بادل سا چھا رہا ہے　　طوفان بے کسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دورِ حسرت دنیا سے جا رہا ہے　　مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور "ہوم رول" ہوگا

"ہوم رول" کیا ہے! یہ چکبست کی زبانی سنیئے ؎

یہ آرزو ہے کہ مہر ووفا سے کام رہے　　وطن کے باغ میں اپنا بھی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گُل چیں نہ صبح وشام رہے　　نہ کوئی مرغِ خوش الحاں اسیرِ دام رہے

سر پہ شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدارِ چمن

اسی مقصد کو ایک شعر میں انھوں نے یوں ظاہر کیا تھا ؎

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری　　کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

یہ نظریہ دراصل مبدل تخیل کی پیداوار ہے۔ مسز اینی بسنٹ، مشہور کانگرسی خاتون اس کی زبردست حامی تھیں، اور چکبست اُن کے وفا شعار پیرووں میں سے تھے، اس لیے بھی "ہوم رول" کا راگ الاپتے ہیں جس کا اُن کو اعتراف بھی ہے ؎

زمینِ ہند کی رتبے میں عرشِ اعلیٰ ہے　　یہ "ہوم رول" کی اُمید کا اُجالا ہے
مسز بسنٹ نے اس آرزو کو پالا ہے　　فقیر قوم کے ہیں، اور یہ راگ مالا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

قومی تعصبات کی بنا پر اکثر مفکرین "ہوم رول" کی کامیابی کے متعلق اندیشہ ظاہر کر رہے تھے، کیوں کہ کشاکشِ باہمی کی بدولت خاکِ ہند کا دامن قوسِ قزح بنا ہوا تھا، مگر چکبست کا خیال تھا ؎

جو "ہوم رول" پہ بہ چشمِ شوق شیدا ہو　　تمام رنگ میں ایک نور پیدا ہو

اس زمانے میں "ہوم رول" ہی اہلِ ہند کا کعبۂ آرزو تھا جس کے لیے چکبست تو اپنی بساط سے زیادہ سعی و کاوش پر آمادہ نظر آتے ہیں حتیٰ ایں کہ اُن کو مقید ہو جانا بھی گوارا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے　　خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتریِ درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے　　یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

اس سلسلے میں انھوں نے محسوس کیا کہ ملک کے نوجوانوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے، وہ عیش و نشاط کے دل دادہ ہیں ملکی مسائل سے اُن کو دلچسپی ہے اور نہ ہمدردی۔ اور یہ لاپروائی دراصل جہالت اور صحیح تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ ملک میں کوئی ایسا علمی ادارہ نہ تھا جو تشنگانِ علم کی پیاس بجھا سکتا۔ یہ بڑی بدبختی تھی۔ بعض ہمدردانِ قوم نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور بالآخر ایک قومی جامعہ کی تشکیل کا لائحہ عمل پیش کیا گیا۔ یہ عظیم الشان کام کسی محبِ وطن کی تنہا اعانت سے سرانجام نہیں پا سکتا تھا، اس لیے چندہ کی اپیل کی گئی۔ چکبست جہالت کی تاریکیوں کو شمعِ علم کی ضیا پاشیوں سے دور کرنے کے آرزومند تھے ہی۔ انھوں نے فی الفور بانیانِ ادارہ کی ہمت افزائی کی، اِن کے مستحسن اقدام کو سراہا، اور اربابِ سطوت و ثروت کو اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ کیوں کہ قومی ترقی اور افلاس کا واحد علاج ان کے نزدیک تعلیم کی فراوانی ہی سے ممکن تھا، اس لیے وہ پہلے تو

قوم کی جہالت اور اس کے مضر اثرات کا ذکر کرتے ہیں ؎

گھٹائیں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ و تار
یہ آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار
مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوئے بیدار
تو جان لو کہ ہے اس قوم کی چتا تیار

مٹے گا دین بھی اور آبرو بھی جائے گی
تمہارے نام سے دُنیا کو شرم آئے گی

پھر نہایت حُسن و خوبی سے حرفِ مدعا زبان پر لاتے ہیں ؎

یہ کارِ خیر دِہ ہو نام چار سُو رہ جائے
تمہاری بات زمانے کے روبرو رہ جائے
جو غیر ہیں انھیں ہنسنے کی آرزو رہ جائے
غریب قوم کی دُنیا میں آبرو رہ جائے

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو
فقیر قوم کے آتے ہیں جھولیاں بھر دو

من بعد وہ نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور اُن کو نصیحت کرتے ہیں کہ خوابِ غفلت سے چونک اُٹھو، بساطِ عیش اُلٹ دو، اور حصولِ علم میں ہمہ تن مصروف ہو جاؤ کہ جوانی اُس شگفتہ پھول کی مانند ہے جو زوالِ آفتاب کے ساتھ پژمُردہ ہونے لگتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

چمنِ عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب
خُم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
نشۂ علم میں، ہر وقت رہو تم غرقاب
شانِ تعلیم بھی ہے یہی تہذیبِ شباب

لے اُڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پیئے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

بالعموم نوجوان چند متداول کتابوں پر عبور حاصل کر کے اپنے آپ کو "پانچویں سواروں" میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے متعلق چکبست نے نہایت چچی تلی رائے دی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نشۂ علم میں تم میں سے نہیں کوئی بھی چُور
دخل رہتا ہے طبیعت میں تعلّی کو ضرور
ہو گیا ہے جو ذرا چار کتابوں پہ عبُور
تو غضب کی ہمہ دانی ہے قیامت کا غرُور

شانِ ارسطو کی بھی فرعون کا سامان بھی ہے
وہی گھر مصر بھی ہے اور وہی یونان بھی ہے

اب ذرا اُن عالی قدر حضرات کی حالت ملاحظہ کر لیجیے جو کعبۂ یورپ کے طواف سے مشرف ہو کر زینت دہِ وطن ہوتے ہیں ؎

حجِ اکبر سے جو یورپ کے ہوئے ہیں ممتاز　　ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر انھیں ناز
بیر یارانِ طریقت سے تو غیروں سے ہے ساز　　وہ بنائی ہوئی چتون وہ انیلے انداز

لب و لہجے میں لگاوٹ ہے طرحداری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

یورپ سے آخر یہ لوگ کیا سیکھتے ہیں؟

اُن کو تہذیب سے یورپ کی نہیں کچھ سروکار　　ظاہری شان و نمائش پہ دل و جاں سے نثار
ہیں وہ سینے میں کہاں غیرتِ قومی کے شرار　　جن سے مغرب میں ہوئے خاک کے پتلے بیدار

سیرِ یورپ سے یہ اخلاق و ادب سیکھا ہے
ناچنا سیکھا ہے اور لہو و لعب سیکھا ہے

شاعر ایسا کہنے میں کہاں تک حق بجانب ہے، یہ اربابِ نظر فیصلہ کریں۔ البتہ مغربی تعلیم کے فیض یافتہ ہونے کے باوجود چکبست قدیم آئینِ وضع داری کی پابندی کو ناگزیر سمجھتے تھے، اس لیے اہلِ مغرب کی کورانہ تقلید اُن کے نزدیک مستحسن نہ تھی۔ کہتے ہیں ؎

اپنے ہی دل کا پیالہ پیے مدہوش ہوں میں　　جھوٹی پیتا نہیں مغرب کی وہ مے نوش ہوں میں

چنانچہ تہذیبِ جدید کے پرستاروں پر جب اُن کی سخت نکتہ چینیوں کا کوئی اثر مترتب نہ ہوا تو دبی آواز میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ؎

نئی تہذیب کے صدقے نہ شرمانے دیا دل کو　　ہے منطق کے پردے میں کرشمے بےحیائی کے

ذیل کی نظم اُن کے بلند آہنگ عزائم اور اصلاحی خیالات کی تفسیر ہے جو قوم لڑکیوں کو مغرب زدہ مردوں کی بےجا تقلید سے باز رکھنے کے لیے لکھی گئی تھی ؎

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز　　داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم　　تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں　　ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

خود جو کرتے ہیں زمانے کی روش کو بدنام | ساتھ دیتا نہیں ایسوں کا زمانا ہرگز
پوجنے کے لیے مندر جو ہے آزادی کا | اُس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مَردوں کو نہیں | یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مرکز ہے تمہارا زانو | پاس مَردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو | دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لَے جس میں سما ہی نہ سکے | راگ ایسا کوئی اُن کو نہ سکھانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہو اس وقت کا رنگ | ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رُلانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

یہ حکیمانہ مقولے ہیں، اور معنویت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ آج بھی قوم کے مَرد و زن ان کو حرزِ جان بنائیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے قوم کے اولوالعزم رہنماؤں کی وفات پر مرثیے بھی لکھے ہیں جو ہر آئینہ اُن کے قلبی تاثرات کے مظہر ہیں۔

چکبست نے ایک سچّے اور بے لوث خادمِ وطن کی طرح ملک و قوم کی مقدور بھر خدمت کی۔ قوم کی کمزوریوں کو اُجاگر کیا اور اُن کے متعلق بےباکانہ ذاتی رائے کا اظہار کرکے ناقابلِ فراموش اخلاقی جرأت کا سبق دیا۔ اُن کی قدر و منزلت فزوں تر ہو جاتی ہے، جب وہ قومی اور ملکی مفاد کے لیے فرقہ وارانہ تعصبات کو نظر انداز کرکے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازۂ کہن کو رشتۂ اُخوت و الفت سے مضبوط اور مربوط کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ آزادیٔ کامل کے لیے بیتاب پاتھے، مگر حقوق نظریئے کے حامی ہونے کی وجہ سے غیر آئینی جدوجہد کو مُہلک اور مصلحت و دور اندیشی سے بعید سمجھتے تھے۔ تاہم اگر یہ سچ ہے کہ شاعر کا کلام اس کے جذبات کی کمیّت اور کیفیت کا آئینہ دار ہے تو، بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی شاعری تعصبات سے یکسر پاک ہے اور اس میں قومیت و وطنیت کا وہ بصیرت افروز اور تابناک درس موجود ہے جس سے بے حس دلوں میں

حُب الوطنی کا بے تھاہ سمندر جُوش زن ہو سکتا ہے۔

سید مہدی حسین (عثمانیہ)

معاشی تقسیمِ عمل

جب تمدنِ انسانی ابتدائی منازل میں تھا، انسانی احتیاجات قلیل اور محدود تھیں، اُن کی تکمیل کے ذرایع بھی محدود تھے۔ ذرایع پیدائش قلیل اور زندگی کا معیار پست تھا۔ انسان کو وسایلِ قدرت پر بہت کم تصرف حاصل تھا، اسی لیے مختلف شعبہ ہائے پیدائش کا کوئی وجود نہ تھا۔ صنعت و حرفت کا شعبہ وجود میں نہ آیا تھا۔ ذرایع آمدورفت نہایت ہی خستہ حالت میں تھے۔ تجارت کا رواج نہ تھا۔ خود زراعت بھی نہایت ہی ادنیٰ حالت میں تھی۔ شہری یا شہری آبادی ابھی وجود میں نہ آئی تھی، محض دیہات بستے تھے۔ ہر گاؤں چند خاندانوں پر مشتمل ہوتا تھا، اور ہر خاندان اپنی جملہ ضروریات کا خود ذمہ دار ہوتا تھا۔

انسانی تمدن آگے قدم بڑھاتا گیا۔ وسایلِ قدرت پر انسان کو تصرف حاصل ہوتا گیا۔ احتیاجات میں اضافہ اور معیارِ زندگی بلند ہوتا گیا، ساتھ ہی دیہی آبادی مختلف پیشوں میں تقسیم ہوتی گئی۔ ہر فردِ اہلِ قریہ کی جملہ ضروریات میں سے کسی ایک ضرورت کی فراہمی کا ذمہ دار ہوتا گیا، اور مختلف افراد ایک دوسرے کی فراہم کردہ اور تیار کردہ اشیاء سے تبادلہ کرنے لگے، اور اس طرح اُن کی ضروریات رفع ہونے لگیں۔ ایک فرد دوسرے فرد کی محنت کے نتائج سے مستفید ہونے لگا اور یہیں سے مبادلہ یا لین دین کے طریق کا رواج شروع ہوا۔ تقسیمِ عمل کی اس منزل میں ہر فرد کسی ایک شئے کی تیاری میں مصروف رہتا تھا، لہٰذا گاؤں کی آبادی میں مختلف پیشہ ور مثلاً کمہار، لوہار، نجار، موچی، معمار، خیاط، خاکروب، دھوبی، حجام، سُنار وغیرہ پیدا ہو گئے۔

تقسیمِ عمل کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ گاؤں کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے وسایلِ آمد و رفت میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں اور بجائے اس کے کہ ایک فرد کسی شئے کی مکمل تیاری کا ذمہ دار ہو کئی افراد کسی ایک چیز کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک ہی کام کے مختلف حصے قرار دیے جاتے ہیں اور مختلف حصوں کی تیاری مختلف افراد کے ذمے قرار پاتی ہے، مثلاً ایک ٹرنک کی تیاری میں ایک شخص ٹرنک کا خاکہ کھینچتا ہے، دوسرا کاٹتا ہے، تیسرا کیلیں جڑتا ہے، چوتھا رنگ سازی کرتا ہے۔ اس طرح تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ بڑے بڑے کارخانوں میں جہاں مشین کا استعمال ہوتا ہو کوئی شئے اس وقت تک تکمیل نہیں پاتی جب تک کہ وہ بیسیوں افراد کے ہاتھوں سے نہ گذرے۔ پارچہ بافی، مشین سازی اور مختلف صنعتی کاروبار میں ہم یہی حال دیکھتے ہیں۔ گویا تقسیمِ عمل پیدایشِ دولت کا وہ طریقہ ہے جس کے تحت ایک شئے کی تیاری متعدد اور مختلف حصوں میں تقسیم کی جاتی ہے اور ہر حصہ ایک جداگانہ مزدور کے تفویض کیا جاتا ہے اور ہر شخص کی موزونیت کا رکا خاص لحاظ کیا جاتا ہے۔ ہر مزدور اپنی موزونیتِ طبع اور مشق کے مطابق ایک ایک چیز کی تیاری کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اس طرح مختلف مزدوروں کے اتحادِ عمل سے کوئی شئے تکمیل پاتی ہے۔

تقسیمِ عمل کی وسعت کے ساتھ اصولِ تخصیص بھی نمودار ہوا، کیوں کہ کسی ایک چیز یا کسی ایک جُز پر تمام تر تجربہ اور محنت صرف کرنے سے کمال حاصل ہوتا ہے اور ایسے افراد جو اس اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں ماہرین کہلاتے ہیں۔ اصولِ تخصیص کا علم اور قوموں کو بھی صدیوں قبل تھا اور اسی پر عمل بھی ہوتا تھا، مگر زمانۂ موجودہ میں یورپ اور امریکہ میں اس اصول پر نہایت ہی اہتمام سے عمل ہوتا نظر آتا ہے۔

تقسیمِ عمل کی ایک اور صورت ہے جس کو ارضی تقسیمِ عمل کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ملک یا ایک ہی ملک کے مختلف حصص صرف انھیں اشیاء کی تیاری کے لیے مخصوص ہو جائیں جنھیں وہ کم سے کم مصارف سے حاصل کر سکتے ہوں اور دوسرے ممالک مبادلے کے ذریعے ایک دوسرے کی پیداوار سے مستفید ہوں۔

بین الاقوامی تجارت اور تجارتِ خارجہ کا دارومدار اسی اصول پر مبنی ہے۔ ہر ملک آسانی کے ساتھ ایسی اشیاء حاصل کر سکتا ہے جن کو وہ پیدا نہیں کر سکتا یا اگر پیدا کر سکتا ہو تو مقابلۃً گراں مصارف سے۔

تقسیمِ عمل کے فواید ہم جانتے ہیں کہ تقسیمِ عمل کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت ہر فرد سے صرف وہی کام یا ایک کام کا صرف وہی حصہ متعلق رہے جس کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ موزوں ہو۔ کسی کام کے کل حصے یا اجزا برابر نہیں ہوتے۔ اگر ہم کسی شئے کی تیاری میں اُس کے مختلف حصوں کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُس میں دشوار اور آسان حصے موجود ہیں۔ تقسیمِ عمل کی بدولت جب دشوار اور آسان حصے الگ الگ ہو جاتے ہیں تو ہر مزدور کی صلاحیت اور طاقت کے مطابق کام کا ایک حصہ تفویض کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ عورتیں اور بچے بھی اپنی صلاحیت کے مطابق کسی کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس طرح محنت بھی ضایع نہیں جاتی اور کام بھی عمدہ ہوتا ہے۔ اس تقسیم سے ایک تو آجر کے مصارف میں کفایت ہوتی ہے۔ دوسری طرف مزدور کی مجموعی خاندانی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ تقسیمِ عمل کے طریق پر کاربند ہونے سے دوسرا بڑا فایدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کی بدولت مزدوروں کو مشق بہم پہنچتی ہے اور مہارت تامہ حاصل ہو جاتی ہے، کیوں کہ جس قدر کسی کام میں زیادہ مشق ہوتی ہے اُسی قدر اُس میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ تقسیمِ عمل کے تحت چونکہ مزدور ایک ہی کام کو بار بار دُہراتا رہتا ہے لہٰذا اُس کے کام میں خاصی مہارت اور صفائی پیدا ہو جاتی ہے۔

وقت کی بچت اور راصل کی کفایت تقسیمِ عمل کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ جب کوئی مزدور کسی کام کو از ابتدا تا انتہا انجام دیتا ہے تو اُس کو متعدد کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ ایک کام کو چھوڑ کر دوسرا کام شروع کرنے میں وقت ضایع ہوتا ہے اور اس دورِ مسابقت میں تھوڑے سے وقت کی بھی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی طرح کسی کام کو انجام دینے میں مختلف آلات و اوزار استعمال کیے جاتے ہیں۔

جب تک مزدور کسی کام کے ایک حصے میں منہمک رہتا ہے اُس وقت تک دوسرے کاموں کے آلات و اوزار بے کار پڑے رہتے ہیں۔ پیدائشِ دولت میں یہ صورت مضرت رساں ہے۔ تقسیمِ عمل کی بدولت وہ تمام وقت جو ایک کام چھوڑ کر دوسرا کام شروع کرنے میں صرف ہوتا ہے بچ جاتا ہے۔ دوسری طرف کسی کارخانے کا جملہ اصل برسرِ کار رہتا ہے۔

تقسیمِ عمل کے فوایدکا کچھ اندازہ ذیل کی مثال سے ہوسکے گا:۔

آدم اسمتھ اپنے زمانے کے الپین سازی کے کارخانے کا چشم دید حال لکھتا ہے جو الپین بلا مشق دن بھر میں ایک بھی بہ مشکل تیار ہوسکتی ہے تقسیمِ عمل کی بدولت حیرت انگیز سرعت سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے بنانے کا طریق یہ ہے کہ ایک شخص تار کھینچتا ہے، دوسرا اُس کو سیدھا کرتا ہے، تیسرا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتا ہے، چوتھا نوک نکالتا ہے، پانچواں گھنڈی بٹھانے کے لیے دوسرے سرے کو درست کرتا ہے۔ تین چار مسلسل ترکیبوں سے گھنڈی تیار ہوتی ہے۔ گھنڈی جمانا، الپین نکھارنا اور اُن کو کاغذ میں ترتیب سے لگانا سب جدا جدا کام ہیں۔ گویا الپین سازی کا طریقہ تقریباً اٹھارہ کاموں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔

آدم اسمتھ نے معمولی کارخانے کا حال لکھا ہے لیکن تقسیمِ عمل کے زور سے دس آدمی دن بھر میں تقریباً اڑتالیس ہزار الپین بنا لیتے ہیں تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تخمیناً چالیس پیشے گھڑی سازی سے اور ستّو سے زیادہ کپڑے کی تیاری سے متعلق ہیں[1]۔

تقسیمِ عمل کا ایک نمایاں فایدہ یہ بھی ہے کہ اس کی بدولت مشینوں کی ایجاد اور اُن کی اصلاح کے بیشتر مواقع نکل آئے ہیں جب کوئی مزدور اپنا پورا وقت کسی ایک مشین پر صرف کرتا ہے تو اُسے اس بات کا موقع ملنا یقینی ہے کہ اُس مشین میں کوئی زیادہ مفیدِ مطلب نئی بات کیوں کر پیدا کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ مشینوں کی اصلاحات خود مزدور طبقے کے افراد نے اکثر و بیشتر کی ہے۔

---

[1] اصول معاشیات (برنی)۔

تقسیمِ عمل کے نقائص ۱۔ تقسیمِ عمل کے خلاف ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے مزدور کی واقفیت کا دایرہ نہایت ہی محدود ہو جاتا ہے۔

بجز اُس قابلیت کے جو اُسے اپنے اس مفوضہ کام کو انجام دینے کے لیے حاصل رہتی ہے وہ دیگر صلاحیتوں اور قابلیتوں سے محروم رہتا ہے لیکن یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے کیوں کہ کسی ایک کام میں مہارت اور خصوصیت حاصل کرنے کے یہ ہرگز معنے نہیں کہ وہ دنیا میں کسی کام ہی کا نہ رہے۔ ہم کسی ایسے طبیب پر جو اپنے فن میں کسی ایک شعبے کا ماہر ہو ہرگز یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ اُس کی عام قابلیت اور عام معلومات کا دایرہ بالکل محدود ہے کیوں کہ تخصیصِ کار سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دنیا سے بے خبر ہے۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے ماہرین کا معیار بہ لحاظ عام قابلیت بلند ہی رہتا ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ کسی کام کے ایک چھوٹے سے جُز کو بار بار دُہرانے سے مزدور کو اپنے کام میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی بلکہ ایک طرح کی بیزاری پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ وہ شخص دنیا میں کیا حظ و لطف حاصل کر سکتا ہے جس کی عمر الپن کی نوک بنانے میں صرف ہو جائے یہ اعتراض بھی عملی میدان میں کوئی وزن نہیں رکھتا کیوں کہ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ تقسیمِ عمل، مشین کے استعمال اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے ذریعے دولت بہ افراط پیدا کی جاتی ہے۔ پیدائشِ دولت میں جوں جوں آسانیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں مزدور اوقاتِ کار میں تخفیف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تخفیفِ اوقاتِ کار کے ساتھ مزدوروں کو دیگر تفریحی مشاغل میں حصہ لینے کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے اور بہ حیثیتِ مجموعی قوم میں اضافۂ دولت سے مزدوروں کی اُجرت میں بھی اضافے کی گنجایش ہے جس کے باعث معیارِ زندگی بلند ہوتا اور مالی اعتبار سے بھی زندگی کے کچھ نہ کچھ دلچسپیوں میں حصہ لینے کا موقع نکل آتا ہے، اور بجائے کوفت کے اُن کی زندگی پُر لطف گذرنے لگتی ہے۔

۳۔ تقسیمِ عمل پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ مزدور صرف ایک کام سے یا ایک کام کے کسی ایک جُز سے واقف رہتا ہے اس لیے اگر اُس کو اُس کام میں

ناکامی ہو تو وہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ اعتراض بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کیوں کہ تقسیم عمل کی بدولت پیشہ کا کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو کر بہت ہی آسان ہو جاتے ہیں اور اُن کا سیکھنا بجائے مشکل ہونے کے آسان ہو جاتا ہے۔

۴۔ تقسیم عمل کی بدولت عورتوں اور بچوں سے بھی کارخانوں میں کام لینے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے معاشرتی بُرائیوں کے پیدا ہونے کا بڑی حد تک اندیشہ ہے۔ حقیقتاً یہ اندیشہ ایسا ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر قوانینِ کارخانہ جات حکومت کی مداخلت و نگرانی اور خود مزدور طبقات میں تعلیم اور بیداری پیدا کر کے ان خرابیوں کا سدِباب کیا جا سکتا ہے۔

آدم اسمتھ کے اس بیان میں بڑی حد تک صداقت موجود ہے کہ تقسیم عمل کا انحصار بازاروں کی وسعت پر موقوف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی تمدن جب اپنے ابتدائی منازل طے کر رہا تھا انسانی احتیاجات محدود تھیں، ساتھ ہی اُن کی تکمیل کے ذرائع بھی محدود تھے۔ ذرائع معاش قلیل اور معیارِ زندگی ادنیٰ تھا۔ مختلف شعبہ جات پیدائش اپنے ابتدائی منازل طے کر رہے تھے، یعنی زراعت، صنعت و حرفت، تجارت ابھی ادنیٰ حالت میں تھے۔ انسانی آبادیاں چھوٹے چھوٹے دیہات پر مشتمل تھیں، ذرائع آمد و رفت دشوار تھے، ہر گاؤں میں کچھ خاندان بستے تھے۔ ہر گاؤں کیا بلکہ ہر خاندان اپنی جملہ ضروریات کی فراہمی کا خود ذمہ دار ہوتا تھا۔ مبادلہ اشیاء بہ الفاظ دیگر ایک دوسرے کی بنائی ہوئی اشیاء سے مستفید ہونے کا کوئی طریق رائج نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ نہ تو تقسیم عمل کی ضرورت تھی اور نہ تقسیم عمل کا رواج تھا۔ بہ الفاظ دیگر بازاروں کی عدم وسعت تقسیم عمل میں مانع تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمدنِ انسانی جوں ہی آگے قدم بڑھاتا ہے، زراعت، صنعت و حرفت، اور تجارت میں جیسے جیسے ترقی ہوتی جاتی ہے مبادلے کا رواج جوں جوں پھیلتا جاتا ہے، گویا بازاروں میں جیسے جیسے وسعت پیدا ہوتی ہے تقسیم عمل میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

آدم اسمتھ کے قول کی تائید حقیقی واقعات کے مشاہدے سے بھی ہوتی ہے۔ ایک صنّاع اُسی قدر اور اتنی ہی تعداد میں مصنوعات تیار کرے گا جتنی کہ اُن کے فروخت میں

گنجایش موجود ہے جیسے جیسے اُن کی مانگ میں اضافہ ہوتا جائے اسی طرح پیدائشِ مصنوعات میں بھی وہ اضافہ کرتا ہے، پیمانہ کاروبار وسیع ہوتا ہے۔ پیمانہ کاروبار جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے تقسیمِ عمل کا رواج بھی پھیلتا جاتا ہے، گویا تقسیمِ عمل کا انحصار اور اس کی ترقی کسی شئے کے لیے وسیع بازار کے مہیا ہونے پر ہے۔

وسایلِ حمل و نقل کی سہولتوں اور ترقی کے ساتھ صنعت وحرفت اور تجارت کی ترقی بہت کچھ وابستہ ہے۔ انیسویں صدی میں ذرایع حمل و نقل کی ترقی کے ساتھ صنعت وحرفت اور تجارت میں نمایاں ترقی ہوئی اور صنعتی اور تجارتی ترقی نے تقسیمِ عمل کے لیے ایک وسیع میدان پیدا کر دیا۔ قرونِ وسطیٰ اور دورِ جدید کے ابتدائی زمانے میں وہی مصنوعات اور اشیاء دور دراز ممالک کو بھیجے جاتے تھے جو بہ لحاظ اپنی جسامت کے زیادہ قیمت و وقار کے حامل ہوتے تھے مثلاً قیمتی ادویات، عمدہ کپڑے، قیمتی ہتھیار اور جواہر وغیرہ صرف محدود طبقات میں استعمال ہوتی تھیں، کیوں کہ مصارفِ نقل و حمل کی دقتوں اور گراں مصارف کی وجہ متوسط اور کم قیمت والی اشیاء دور دراز فاصلوں پر روانہ نہیں کی جاسکتی تھیں، لہذا تجارتِ خارجہ کا دایرہ محدود تھا اسی لیے اکثر ممالک بیشتر اشیاء کی حد تک خود مکتفی تھے، لہذا اسی قسم کے اشیاء کا پیمانہ کاروبار بھی محدود ہوتا تھا۔ جہاں پیمانہ کاروبار محدود اور چھوٹا ہو وہاں تقسیمِ عمل کی روز افزوں وسعت اور ترقی کی کوئی گنجایش نہیں۔ جیسے جیسے دخانی جہازوں کی ایجاد و ترقی ہوئی ریلوں کا جال پھیلتا گیا۔ نہریں نکالی گئیں، تجارتِ خارجہ میں ترقی ہوتی گئی، پیمانہ کاروبار بڑھتا گیا، اور تقسیمِ عمل میں ترقی ہوتی گئی۔

ہم جانتے ہیں کہ تقسیمِ عمل کی ایک قسم ارضی تقسیمِ عمل یا جغرافیائی تقسیمِ عمل ہے۔ جغرافی تقسیمِ عمل اُس وقت تک بر سرِ عمل نہیں آسکتی جب تک کہ بازار میں وسعت نہ ہو۔ کیونکہ جغرافی تقسیمِ عمل سے مراد ہی یہ ہے کہ ہر ملک یا ایک ہی ملک کے مختلف حصے صرف انھیں اشیاء کی تیاری اور پیداواروں کے لیے مخصوص ہو جائیں جنھیں وہ زیادہ آسان اور مقابلتاً کم مصارف سے تیار کر سکیں، اور بعد ازاں ایک دوسرے کے

جغرافی خصوصیات اور محنت کے نتائج سے مستفید ہوں۔ غرض ایک خطۂ ملک یا ایک ملک کا دوسرے ملک کے محنت کے نتائج سے مبادلہ ضروری ہے، گویا بازار کی وسعت اس تقسیمِ عمل کے لیے شرطِ لازم ہے۔

حالیہ کساد بازاری میں جب کہ تجارتِ خارجہ بہت کچھ گھٹ گئی تھی اور بین الاقوامی بازار محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ تقسیمِ عمل خصوصاً جغرافی تقسیمِ عمل پر بہت ہی مضرت رساں اثرات مترتب ہوئے ہیں۔



محمد عنایت حسین بی، اے (عثمانیہ)

حیدرآباد دکن کی صبح[١]

(وِیکاجی ہوٹل سے)

شہر اب تک سو رہا ہے نیند کی آغوش میں
وجد محوِ فکر ہے اس منظرِ خاموش میں

ہلکی ہلکی چاندنی، جھونکے ہوا کے کیف بار
ہو رہی ہے جذب گویا ذرّے ذرّے میں بہار

ہے فلک پر ملگجے بادل کا اک ٹکڑا رواں
یا جھکولے کھا رہی ہے کشتیِ بے بادباں

ناؤ دن کی گھومتی ہے رات کے گرداب پر
صبح لیکن سو رہی ہے بسترِ کمخواب پر

بخششِ فطرت سے قسمت جاگ اٹھی دید کی
سمتِ مشرق دفعتاً پھوٹی کرن خورشید کی

روشنی میں لٹ رہی ہے دولتِ نورِ سحر
آبِ زر سے ڈھل رہے ہیں کہنہ سقفِ بام و در

ذرہ ذرہ فیضِ خاور سے بہشت آثار ہے
دامنِ کہسار میں اک حسن کا بازار ہے

قصرِ عالی کر رہے ہیں کوہ سے سرگوشیاں
شوق میں جن کے دروں پر جھک رہا ہے آسماں

سبز پوش اشجار زریں چادریں اوڑھے ہوئے
صبح کی دیوی کے آگے دست بستہ ہیں کھڑے

اک طرف ہیں طائروں کے نرم و نازک چہچہے
دوسری جانب حسینوں کے رسیلے قہقہے

اوس نے موتی لٹائے ہیں زمیں پر اس قدر
جھک رہا ہے بار سے احسان کے سبزے کا سر

. . . .

سمتِ مغرب غم کناں ہیں قطب شاہی مقبرے
جن کے نظارے سے دل کے زخم ہوتے ہیں ہرے

سامنے بالاحصارِ قلعہ کی بارہ دری
کر رہی ہے سب پہ ثابت آج اپنی برتری

کیا متانت آفریں ہے شہرِ[٢] ویراں کی فصیل
جھک چکے ہیں جس کے آگے فرقِ شاہانِ جلیل

اس زمینِ مہر و مہ پر بے کسی ہے حکمراں
دہر میں مشہور ہیں جس کی زمرد خیزیاں

جس کی مٹی سے اٹھے وہ صاحبِ سیف و قلم
دیدۂ مشتاق ہے جن کے واسطے صدیوں سے نم

. . . .

١۔ اس نظم کا ایک حصہ رسالہ "شہاب" میں شائع ہو چکا ہے بعض اہم تبدیلیوں کے بعد اب مکمل نظم ہدیۂ ناظرین ہے۔

٢۔ گولکنڈہ۔

دلنشیں و دل کشا ہے منظرِ سمتِ جنوب　　رودِ موسیٰ کے کنارے مل رہے ہیں زشت و خوب
ہر محل کے پاس ہی کچھ جھونپڑے آباد ہیں　　مہر و اُلفت کے انھیں سارے فسانے یاد ہیں
اب تو ہمسایوں سے پڑتا ہے تعیش میں خلل　　مقبروں سے کم نہیں کچھ عہدِ حاضر کے محل

. . . .

ایک ساگر موجزن ہے جوش میں سمتِ شمال　　حُسن کا اپنے شبِ مہ پھینکتی ہے جس پہ جال
گر فضا پُرکیف ہو، اور کھل رہی ہو چاندنی　　اس کے ساحل پہ نظر آتی ہیں موجیں حُسن کی
زور جن موجوں پہ تیراکوں کے چل سکتے نہیں　　ڈوبنے والے کبھی جن کے اچھل سکتے نہیں

. . . .

سمتِ مشرق ضو فشاں ہے حکمتِ عثمانیہ　　آفتابِ علم، یعنے جامعۂ عثمانیہ
روشنی میں چل رہا ہے جس کی سارا کارواں　　ڈھل رہی ہیں آج مستقبل کی اُمیدیں جہاں

. . . .

کیا فضا ہے، کیا سماں ہے، کیا ہوا ہے فرحناک!　　ہر قدم پر دامنِ دل ہو رہا ہے چاک چاک
مست ہیں جوشِ جوانی میں نہالانِ چمن　　کیا شباب آور ہے صبحِ حیدرآبادِ دکن!

. . . .

چہرۂ گیتی ابھی بے انتہا معصوم تھا　　سامنے "بس" آکے ٹھیرے گی کسے معلوم تھا!
اس قیامت نے متاعِ فکر کر دی پائمال
پُرزے پُرزے ہو گئی کھنچتے ہی تصویرِ خیال

سید سکندر علی وجد

بی، اے (عثمانیہ) ایچ، سی، ایس

مسعود مرحوم، علامہ اقبال اور مجلۂ عثمانیہ

رسالۂ اردو کے مسعود نمبر میں "مسعود مرحوم" کے عنوان سے علامہ اقبال مرحوم کی یہ نظم چھپی ہے :—

یہ مہر و مہ، یہ ستارے، یہ آسمان کبود
کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود

خیالِ جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود

رہی نہ آہ، زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ "احمد" و "محمود"

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ قافلے کا متاعِ گراں بہا "مسعود"

مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحرخواں کو جانتے ہیں سرود

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است" (سعدیؒ)

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمرِ گریز پا کیا ہے؟
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے؟

ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور
مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا؟ کیا ہے؟

غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے؟

دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز
نہیں تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے؟

جہاں کی روحِ رواں لا الٰہ الا ھو
مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے؟

قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے
گناہ گار ہے کون؟ اور خوں بہا کیا ہے؟

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم
طلسمہا شکند آں دلے کہ ما داریم

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات ۔۔۔ کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکراں تیرا ۔۔۔ ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات
خودی ہے مُردہ تو مانندِ کاہِ پیشِ نسیم ۔۔۔ خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات
نگاہ ایک تجلّی سے ہے اگر محروم ۔۔۔ دو صد ہزار تجلّی تلافیٔ مافات
مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر ۔۔۔ زمیں سے تا بہ ثریّا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی ۔۔۔ نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

مجلۂ عثمانیہ کے فانی کی غزل سے شروع ہونے والے شمارہ اوّل جلد گیارہ میں ادارہ نے علامۂ مرحوم کے خلوص اور اُن کی سخن گوئی پر یہ تین اعتراضات عاید کیے ہیں:۔(۱) یہ نظم فرو تر ہے (۲) فرمایش پر لکھی گئی ہے (۳) سوائے پہلے بند کے نظم کے بقیہ حصے کا مسعود مرحوم سے کوئی تعلق نہیں۔

اب ہم مندرجۂ بالا نظم پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ اعتراضات کس حد تک درست ہیں۔

یہ نظم تین بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں مظاہرِ کائنات کی کنہ کے بارے میں حیرانی ظاہر کی گئی ہے "یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود" کون جانتا ہے!۔ پھر "یادگار احمد و محمود" یعنے سرسید احمد خاں کے پوتے اور جسٹس محمود کے دل بند نواب مسعود جنگ کی وفات پر تاسف کا اظہار کیا گیا ہے۔ آخری دو شعر میں سعدیؒ کے ہمنوا ہو کر فرماتے ہیں کہ جس ہستی سے عشق ہو اُس کی جدائی پر آنسو ڈھلک ہی جاتے ہیں۔

اقبال اس زبردست حادثے اور ناقابلِ تلافی قومی نقصان سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ عامیوں کی طرح اپنے موضوع کا ایک ایک کارنامہ بیان کر کے رونے کی بجائے خود موت و حیات کے فلسفے پر غور کرنے لگتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ انسان مرتا کیوں ہے!۔ اس سے زندگی چھین لینے کا الزام کس پر عاید کیا جا سکتا ہے؟ یہاں

باب پنجم

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

آپ تو اہل لشکر کشی اور آئینِ فرماں روائی خوب جانتے تھے۔ بھائی کے ساتھ متعدد معرکوں میں شریک رہے تھے اور خود دست بہ شمشیر ہو کر دشمن سے میدانِ جنگ میں مقابلے کیے تھے۔ تمام پائین گھاٹ اور بالا گھاٹ۔ کرناٹک۔ تلنگانہ اور برار آپ ہی کی قوتِ بازو سے فتح ہوئے تھے۔ غرض آپ نہ صرف ایک دُوراندیش مدبّر اور بادشاہ ہی تھے بلکہ تجربہ کار اور ہوشیار سپہ سالار کے لحاظ بھی آپ کا درجہ بڑا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد سب سے پہلے آپ نے سلطنت کے اندرونی اور بیرونی انتظام اور استحکام کی طرف توجہ کی اور سلطنت کے ہر شعبے میں اصلاحات کر کے اِس کی طرف سے اطمینان حاصل کیا اور اپنے پاکیزہ اخلاق اور رفق و ملاطفت سے خاص و عام کو مطیع و منقاد بنا کر مُلک کو وسعت دینے کے لیے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ سلطنتِ بہمنیہ کو ہمیشہ سے سرحدِ گجرات کی طرف سے حملے کا خوف لگا رہتا تھا، اس لیے سلسلۂ فتوحات کو شروع کرنے سے قبل آپ نے سرحدِ گجرات کے اہم قلعوں پر اپنے معتبر امیروں کو قلعہ دار مقرر کیا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد آپ ملک کے مختلف حصّوں سے کثیر لشکر اور جنگی ساز و سامان جمع کر کے فتوحات حاصل کرنے کے لیے ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء کے آخر میں دارالسلطنت سے باہر نکلے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

سلسلۂ فتوحات میں سب سے پہلے آپ[1] نے وجیانگر کی فتح کا ارادہ کیا کیونکہ دیورائے[2]

---

[1] بہ موجب بیان فرشتہ، ہفت اقلیم اور کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم لیکن برہان مآثر کے مولف کا بیان ہے کہ آپ نے اپنی فتوحات کی ابتدا فتح بیجانگر سے نہیں کی بلکہ فتح مہور سے کی۔ یہ علاقہ پہاڑی تھا۔ وہاں کے لوگوں نے جب آپ کے لشکر کشی کی خبر سُنی تو وہ مقابلے کے ڈر سے پہاڑیوں اور جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گئے۔ شاہی لشکریوں نے ملک کو لوٹا۔ اس کے بعد آپ بہادر لشکریوں کے ساتھ مرہٹ تشریف لے گئے۔ اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد آپ دارالسلطنت کو واپس تشریف لے گئے۔

ان دونوں جنگلوں کا ذکر کسی مورخ نے بیان نہیں کیا ہے۔ شاید یہ معمولی ہونے کی وجہ سے مورخوں نے ان کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ مہور کہاں واقع ہے۔ مرہٹ سے مراد علاقہ مرہٹواڑی ہے۔

برہان مآثر کی رو سے آپ نے ۸۱۹ھ م ۱۴۲۵ء میں فتح قلعۂ کلم کے بعد بیجانگر کی فتح کے لیے ایک کثیر لشکر جمع کیا، اور شہر پر حملہ کر کے فتح حاصل کی۔ آپ کے بہادر سپاہیوں نے ملک میں قتل و غارت اور لوٹ مچائی۔ اس کے علاوہ اس علاقے کے کئی شہر اور قلعے بھی فتح کیے گئے۔ ان فتوحات سے کثیر مالِ غنیمت، قیدی، گھوڑے اور ہاتھی آپ کے ہاتھ آئے۔ اس علاقے کی مکمل فتح کے بعد آپ دارالسلطنت بیدر کو واپس تشریف لائے۔

فیروز شاہ کے آخری عہدِ حکومت میں والیِ بیجانگر نے مسلمانوں اور سلطنتِ بہمنیہ کے ساتھ اس کے پریشانی کے زمانے میں جو کچھ کیا تھا وہ ایک ایک کر کے آپ کو یاد تھا اور اس داغ کو مٹا کر لوگوں کے دلوں میں سلطنتِ بہمنیہ کی رفعت و عظمت قائم کرنا بھی ضرور تھا۔ اس لیے بادشاہ ہونے کے بعد والیِ بیجانگر کی بداعمالیوں کی سزا دینے کی غرض سے آپ نے اپنی فتوحات کی ابتدا فتح بیجانگر ہی سے شروع کی ہوگی۔ اور واقعات کے لحاظ سے بھی آپ کی پہلی جنگ یہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا فرشتے کا قول صحیح اور برہان مآثر کا غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی تائید کسی تاریخ سے نہیں ہوتی ہے۔ فرشتے کی تائید کئی معتبر تواریخ سے ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ فرشتے نے مہور اور مرہٹ کی فتوحات کو اہمیت نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا ہو۔

[2] فرشتے نے والیِ بیجانگر کا نام دیورائے لکھا ہے لیکن کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم کے مورخ نے اپنی تحقیق میں اس کا نام ویرا دیجیا لکھا ہے لیکن عبدالرزاق سمرقندی کے سفرنامے سے فرشتے کی تائید ہوتی ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

راجہ وجیا نگر نے آپ سے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ اس کے علاوہ سلطان احمد شاہ فیروز شاہ کے زمانے کی گذشتہ جنگ میں اس کے ہاتھوں جس قدر زبردست نقصان بہمنیوں کو پہنچا تھا، اس کا بدلہ لینا ضرور تھا۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں سلطنتِ بہمنیہ کی وقعت و عظمت قایم رہے۔ پس چالیس ہزار سوار ہمراہ لے کر وجیا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ دیو رائے راجۂ وجیا نگر کو پہلا واقعہ یاد تھا، اس نے بھی اپنا خوب بندوبست کیا اور رائے ورنگل (تلنگانہ) کی مدد سے مقابلے میں آیا۔ اس کے ساتھ دس لاکھ فوج تھی جو پیادہ، توپچی اور کماندار پر مشتمل تھی۔ دونوں فوجیں دریائے تنگ بھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اُتریں اور دیو رائے کی فوج نے بہمنی لشکر کو چوری اور قتل سے تنگ کرنا شروع کیا۔ اس لیے آپ نے اپنے لشکر کے گرد رومیوں کے قاعدے کے موافق دو ہزار آتش خانوں کے راہ لگاکر مورچے بنائے، اور چالیس روز تک آپ وہاں لشکر کے ساتھ خیمہ زن رہے۔ آپ چاہتے تھے کہ دشمن دریا سے اُتر کر آپ کے لشکر پر حملہ آور ہو، اس واسطے آپ نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ تلنگانے کے علاقے کو اور بیجانگر کے دیہات کو جو تنگ بھدرا کے اس طرف تھے خوب غارت کریں تاکہ دشمن غصّہ ہوکر حملہ کرے۔ مگر جب دشمن کی فوج نہ آئی تو آپ نے اُمرا کو طلب کر کے مشورہ کیا، اور سب نے مل کر قرآن شریف کی قسم کھائی کہ کل دریا کے پار اُتر کر حملہ کریں گے۔ لیکن اس خبر کے مشہور ہو جانے سے پہلے آپ نے عالم خاں، لودی خاں، اور دلاور خاں سردارانِ لشکر کے ساتھ دس ہزار فوج لے کر نہایت پھرتی سے دریا پار کیا، اور دشمن پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت اتفاقاً راجہ دیو رائے نیشکر کے ایک ملے میں سو رہا تھا۔ یہ لوگ اتفاقاً اس طرف جا نکلے۔ دیو رائے نے سمجھا کہ وہ قصداً اس کی طرف آرہے ہیں، اس لیے وہ بہت پریشان ہوکر ملے میں گھس گیا۔ ان لشکریوں نے اوّل نیشکر کھانے کے ارادے سے توڑا، اور ساتھ لے چلنے کے لیے دیو رائے کو ملّے کا مالک سمجھ کر پکڑا جس نے اپنا بھیس بدل دیا تھا۔ اور اس کے سر پر نے شکر کی مولی رکھوا کر اپنے ہمراہ لے چلے۔ راجہ کچھ نہ بولا، اس کو غنیمت سمجھا کہ جان بچی۔ تھوڑی دیر میں خبر اُڑی کہ آپ مع اپنی فوج کے دریا پار اُتر آئے ہیں اور راجہ غائب ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اس لیے اس کا لشکر تہ و بالا ہو گیا۔ اور سپاہی فوراً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور شاہی فوج نے دیو رائے کا مال و اسباب سمیٹنا اور قتل و غارت کرنا شروع کیا۔ اس فرصت میں دیو رائے بھی بھاگ گیا اور دوپہر کو وہ اپنے ایک مصاحب امیر سے ملا۔ اس وقت اس نے تاج پہنا اور چترِ شاہی سر پر رکھ کر اپنے کو اپنی فوج میں ظاہر کیا جس سے کچھ فوج جمع ہو گئی، مگر اس واقعہ کو اس نے فالِ بد سمجھا اور لڑنے کے بجائے اس نے مجبوراً بھاگ کر بیجانگر میں پناہ لی! اور آپ اپنی فوج کے ساتھ اس کے ملک میں گھس گئے اور مال و متاع پایا۔ اسی تاخت و تاراج کے دوران میں ایامِ نوروز آ گئے، اور مارچ ۱۴۲۳ء م ۸۲۶ھ میں لشکر کا قیام ایک پُر فضا مصنوعی تالاب (حوض) کے کنارے ہوا۔ آپ کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن آپ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے اور ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑا کر لشکر سے چھ کوس کے فاصلے پر اکیلے نکل گئے! اور ساتھ کے رفیق بھی جو دو سو کے قریب تھے وہ بھی ادھر ادھر شکار کے پیچھے چلے گئے۔ دشمنوں کے پانچ ہزار سپاہی ایسے موقع کی تلاش میں مدت سے پھر رہے تھے، اور اس کے منتظر تھے کہ جب موقع پائیں آپ کو قتل کر ڈالیں۔ غرض وہ آپ کی تنہائی کی خبر سُن کر گھات سے نکلے اور آپ کو پکڑنے کے لیے دوڑے۔ آپ انھیں پہچان کر سخت مضطرب ہوئے، مگر پھر بھی تجربہ کار بادشاہ تھے ایک طرف دور سے آپ نے ایک چار دیواری دیکھی جو کسی کسان نے اپنے جانور دوپہر کے وقت باندھنے کے لیے بنائی تھی، اس کی طرف رُخ فرمایا۔ کچھ دکنی خادم آپ کے ساتھ تھے۔ ابھی چار دیواری تک نہیں پہنچے کہ آگے نالہ آ گیا اور دشمن پیچھے سے آ پہنچے، خادم سب قتل ہو گئے، اور اب خود آپ کے قتل یا گرفتاری کی باری آ ئی تھی کہ یکایک وہ دو سو رفیق تیر انداز جو شکار کے پیچھے چلے گئے تھے اتفاقاً آ گئے، اور ان سے لڑنے لگے۔ اس فرصت میں آپ چار دیواری تک پہنچ گئے۔ اب یہ رفیق بھی کچھ قتل ہو ہو کر آپ کے پیچھے لڑتے بھڑتے اسی چار دیواری میں آئے، اور وہاں مورچہ بندی کی۔ دشمن پانچ ہزار تھے اور یہ دو سو بھی نہیں رہے تھے، اور پھر بے سرو سامان، تھکے ماندے اور غیر محفوظ مگر اللہ اکبر کہہ کر مقابلے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ خصوصاً سید حسن بدخشی۔ میر فرخ بدخشی۔ میر علی سیستانی۔ میر علی کرد۔ عبداللہ کابلی۔ خسرو بیگ۔

خواجہ حسن اردستانی۔ خواجہ بیگ قلندر اور خواجہ قاسم صف شکن نے اس روز ایسی داد مردانگی سلطان احمد شاہ
دی کہ آپ ان کی تعریف کرتے رہے۔ غرض کہ سب نے مرنے مارنے پر کمر باندھی۔ بہت سے ولی بہمنی کی فتوحات
مسلمان مارے گئے تھے! اور اب دشمنوں نے دیوار توڑنی شروع کی جس کی وجہ سے پریشانی میں
اضافہ ہونے لگا۔ مگر اسی اثنا میں ایک لشکری مسمی عبدالقادر بن عیسیٰ بن محمود بن عماد الملک
سر سلحداران جو دوصدی منصب دار بھی تھا، اس خیال سے کہ ملک بیگانہ ہے، آپ چند
ہمراہیوں کے ساتھ شکار کے لیے تشریف لے گئے ہیں، کہیں دشمن آپ کو آنہ گھیر لیں۔
دو تین ہزار شاہی خاصہ خیل لے کر آپ کی تلاش میں نکلا، اور دور سے یہ ہنگامہ دیکھ کر
قریب آیا تو معلوم ہوا کہ دشمنوں نے آپ کو گھیرا ہے، اور اب پکڑا یا مارا چاہتے ہیں۔
یہ دیکھتے ہی فوراً ان پر حملہ کر دیا۔ گو پانچ سو آدمی مارے گئے، مگر عبدالقادر نے ایک ہزار
دشمن سپاہ کو مار کر آپ تک پہنچ کر آپ کی جان بچائی اور دشمن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

آپ عبدالقادر کی احتیاط اور عاقبت اندیشی کے باعث اس بلا سے
نجات پا کر گویا از سر نو بادشاہ ہوئے۔ آپ جیسے عظیم الشان بادشاہ کا جس کے لاکھوں
جان نثار موجود تھے ایک ہی یورش میں ایسی بلا میں گرفتار ہو جانا اور پھر ایسے
ورطۂ ہلاکت سے صحیح و سالم بچ کر نکل آنا ایک عجیب واقعہ ہے۔ جان بچانے کے صلے میں
آپ نے عبدالقادر کو برادرِ جاں بخش یارِ حق گذار کا لقب اور خطاب خانِ جہاں
اور منصب دو ہزاری دے کر سر لشکری وطرفداریٔ برار سے سرفراز فرمایا۔ اور
اس کے بھائی عبداللطیف کو جو اس کے ہمراہ تھا خطاب خانِ اعظم مع منصب دو ہزاری
دے کر طرفدار و سر لشکر تلنگانہ مقرر کیا۔ میر علی کرد کو لقب کا فرکش اور منصب ہزاری
قاسم بیگ کو لقب صف شکن اور منصب پانصدی اور کلھر اس کی جاگیر میں دیا۔
عبداللہ کابلی کو منصب دار صدہ دے کر جنیر[1] کا حاکم، اور خواجہ بیگ کو خطاب قلندر خاں
دے کر حسن آباد (گلبرگہ) کا داروغہ بنایا۔ اور چونکہ تیر اندازی سے اس وقت بہت فائدہ

---

[1] احمد نگر کے مغرب میں دکن کا مشہور تاریخی مقام ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

ہوا تھا، اس لیے خواجہ حسن اردستانی اور خسرو بیگ اوزبک کو امیر صدہ مقرر کرکے شہزادوں کے استاد تیر اندازی مقرر کیا۔ سید حسن بدخشی۔ میر فرخ بدخشی۔ میر علی سیستانی۔ حسن خاں۔ فرخ خاں اور علی خاں کو خطابات اور سہ صدی منصب دے کر خوش کیا۔ غرض آپ نے اس وقت نہایت فیاضی کے ساتھ خطابات۔ انعامات اور جاگیرات دیں اور شہزادوں اور اُمراء کی اولاد کو حکم دیا کہ وہ تیر اندازی کی تعلیم حاصل کریں۔ اور خلف حسن بصری ملک التجار کو حکم دیا کہ عراقی۔ خراسانی۔ ماوراالنہری۔ رومی اور عربی تین ہزار تیر انداز ملازم رکھے جائیں۔

غرض کہ جب آپ کو اس بلا سے نجات ملی تو آپ نے اپنی تمام فوج لی اور نہایت احتیاط اور سختی کے ساتھ بیجانگر کا محاصرہ کرلیا اور راجہ کو ایسا تنگ کیا کہ وہ مجبور ہوگیا۔ اور صلح کے شرایط ٹھیرا کر تمام پچھلا اخراج۔ نفیس اور گراں بہا ہدیے اور طرح طرح کے تحفے اپنے خاصے کے تیس ہاتھیوں پر۔ لادکر اپنے چھوٹے بیٹے[1] کے ہمراہ نقارہ سرنا وغیرہ باجے بجاکر بھیجا۔ جب اس طرح راجہ کا بیٹا آیا تو اُمراء نے اس کا استقبال کیا اور آپ نے اس سے بغل گیر ہوکر اپنے پاس تخت کے قریب بٹھایا، اور خلعت۔ کمر بند۔ خنجر مرصع۔ عربی اور ترکی گھوڑے۔ پانچ چیتے۔ نو شکاری کتے اور تین باز عنایت کیے جو کرناٹکیوں نے کبھی دیکھے نہ تھے۔ اور دریائے کرشنا تک لاکر اسے رخصت کیا اور خود اپنے دارالسلطنت کو واپس تشریف لے گئے۔ آپ اپنے ساتھ بہت سے قیدی لائے جن میں سے دو نام فتح اللہ[2]

---

[1] ۔ فرشتہ نے اس کا نام نہیں دیا ہے۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم میں اس کا نام دیو رائے لکھا ہے۔

[2] ۔ یہ ذات کا ہندو اور راجایانِ بیجانگر کی اولاد میں تھا۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم میں اس کو ایک برہمن کا لڑکا لکھا ہے جو غلط ہے۔ جنگ میں اسیر ہوکر آنے کے بعد آپ نے اس کو مسلمان کیا اور اس کا اسلامی نام فتح اللہ رکھا۔ اور خانِ جہاں سپہ سالار و طرفدار برار کو بہ طور غلام کے دے دیا۔ اس نے اس کی اچھی طرح سے پرورش کی خوب پڑھایا، لکھایا، اور حسنِ قابلیت کو دیکھ کر اپنا معتمد بنایا۔ لیکن جب وہ مرگیا تو یہ سلاطین بہمنیہ کے غلاموں میں شامل ہوگیا اور محمود گاواں کے طفیل عماد الملک کا خطاب، اور برار کی طرفداری اور سرلشکری اس کو ملی تھی ۸۹۹ھ م ۱۴۹۴ء میں وہ مطلق العنان ہوکر "سلطنتِ عماد شاہیہ" برار کا بانی ہوا جو ۹۸۴ھ م ۱۵۷۶ء تک قایم رہی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اور حسن[1]۔ تاریخ دکن میں اب تک زندہ ہیں۔

تلنگانے کے راجہ نے آپ کے خلاف بیجانگر کے راجہ کو مدد دی تھی، اس لیے آپ نے ایک کثیر فوج جمع کرنے کا حکم دیا اور ۸۲۸ھ م ۱۴۲۴ء میں خود اس لشکر کثیر کے ساتھ تلنگانے پر حملہ آور ہوئے۔ برہان ماثر کے مولف نے لکھا ہے کہ تلنگانے کے لوگ آپ کے آنے کی خبر سن کر اپنے مکانات اور قلعے چھوڑ کر بھاگ گئے اور آپ نے ملک تلنگانہ کی آخری سرحد پر

---

[1] یہ احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا بانی تھا۔ اصل میں یہ ذات کا برہمن تھا، اس کے اجداد پاتری علاقۂ برار کے پٹواری تھے۔ قحط سالی کے زمانے میں وہ اپنا وطن چھوڑ کر بیجانگر چلا گیا تھا۔ وہاں گدائی یا ملازمت پر اپنی گذر اوقات کرتا تھا یہ اسیروں میں گرفتار ہو کر آپ کے پاس آیا۔ اس کا نام تیما بھٹ تھا، مگر آپ نے اس کو خوش سین اور نو عمر تھا اپنے غلاموں میں شامل کر کے اس کا نام حسن رکھا۔ اپنے بیٹے محمد خاں کے ساتھ مکتب میں شریک کیا۔ اس نے تھوڑے دنوں میں فارسی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ یہ ہمیشہ شہزادوں کی صحبت میں رہنے لگا شہزادۂ محمد خاں جب چھوٹا تھا تو اس نے حسن بن بہرینہ کے بجائے بہ تغیر لہجہ حسن بحری کہا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے القاب وخطابات میں اضافہ ہونے لگا۔ محمد شاہ بن ہمایوں شاہ بہمنی نے اس کو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز کر کے منصب ہزاری، نقارہ اور ماہی مراتب بھی عطا فرمایا تھا اور خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں نے اس کو سرلشکر اور طرفدار تلنگانہ مقرر کیا تھا۔ خواجہ جہاں کے قتل کے بعد یہ اس کا قایم مقام ہوا، اور خطاب ملک نایب اور منصب سرلشکر سے بھی سرفراز کیا گیا۔ سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں وکیل السلطنت ہوا۔ آخر یہ اسی بادشاہ کے زمانے میں قتل ہوا، اور اس کے بیٹے احمد نے ۸۹۶ھ م ۱۴۹۰ء میں سلطنت نظام شاہیہ احمد نگر میں قایم کی جو اس کے خاندان میں تقریباً ۱۰۱۶ھ م ۱۶۰۷ء تک قایم رہی۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

پہنچ کر قلعہ مندل اور ورنگل پر قبضہ کیا جو اس علاقے کے خاص قلعے تھے۔ دیورکنڈہ[1] اور راج کنڈہ کے راجاؤں نے آپ کے لشکر سے ڈر کر آپ کے ہاں اپنے قاصد روانہ کر کے اطاعت قبول کی، اور کئی قیمتی تحایف بھیج کر خراج دینا منظور کیا۔ آپ ان پر رحم فرما کر دارالسلطنت بیدر واپس تشریف لے گئے۔ اس حملے کے متعلق فرشتے کا بیان ہے کہ آپ نے ورنگل کے راجہ پر چڑھائی کی اور خود گولکنڈے میں آکر ٹھیر گئے اور خانِ اعظم عبداللطیف طرفدارِ بیدر کو تلنگانے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ تلنگانے کا راجہ سات ہزار تلنگی سپاہیوں کو لے کر مقابلے کے لیے نکلا اور اپنے کُل آدمیوں سمیت مارا گیا۔ خان اعظم عبداللطیف نے تلنگانے کے پایۂ تخت ورنگل پر قبضہ کر لیا۔ خانِ اعظم کی روانگی کے ایک مہینہ میں روز بعد آپ نے بھی گولکنڈے سے تلنگانے کی جانب کوچ کیا۔ راستے میں آپ کو ورنگل کی فتح کی خبر ملی، آپ ورنگل گئے اور وہ عظیم الشان خزانہ جس کو فرماں روایانِ ورنگل نے مدتوں سے جمع کیا تھا جس پر سلطان محمد تغلق کا بھی قبضہ نہ ہو سکا تھا آپ کے قبضے میں آگیا۔ آپ نے دس بڑے ہاتھی میں چھوٹے ہاتھی اور ایک ہار جڑاؤ اور چار مروارید کی تسبیحیں اور چالیس ہزار دینار نقد خانِ اعظم کو عنایت کر کے دوسرے مشہور شہروں کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ اور خود ورنگل میں قیام فرمایا۔ خانِ اعظم تین چار مہینے میں تمام مشہور شہروں پر قبضہ کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس دفعہ بھی آپ نے انھیں شاہی نوازشوں سے سرفراز فرما کر باقی ماندہ ملک تلنگانہ کے قلعوں کی فتح کے لیے روانہ کیا اور خود دارالسلطنت تشریف لے گئے۔

اس فتح کے ایک سال بعد ۸۲۹ھ م ۱۴۲۵ء میں آپ نے قلعہ ماہور[2] کی فتح کا ارادہ کیا۔

---

[1] دیورکنڈہ ضلع نلگنڈہ میں اب تک تعلقے کا مستقر ہے یہاں کا قلعہ پہاڑ پر بنایا گیا تھا جو آج کل ویران اور خستہ حالت میں ہے۔

[2] ماہور جنوبی برار میں بان گنگا کے کنارے نہایت مستحکم اور مرکزی مقام ہے، جہاں کا قدیم قلعہ اب تک موجود ہے۔

اس کے متعلق بھی فرشتہ اور برہان مآثر میں اختلاف ہے۔ برہان مآثر کی روایت کے مطابق سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

قلعۂ ماہور دکن کا ایک بہت مضبوط اور مشہور قلعہ تھا۔ اس کو فتح کرنے کے لیے آپ ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ آپ کی فوجوں نے قلعے کا محاصرہ کیا، اور جو کچھ بھی ملا لے لیا۔ جب محاصرے نے طول کھینچا تو آپ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ محاصرہ اٹھا کر واپس ہو جانا بہتر ہے، پس آپ اپنی فوج کے ساتھ دارالسلطنت بیدر واپس تشریف لے گئے۔ پھر اس کے ایک سال کے بعد ۸۳۰ھ م ۱۴۲۶ء میں قلعۂ ماہور پر ایک کثیر فوج کے ساتھ حملہ آور ہوئے، وہاں کے لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ آپ نے اپنی فوج کو انتہائی کوشش کے ساتھ قلعے پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ آپ کے حکم کے بہ موجب بہادر سپاہی۔ تیر کمان۔ تلوار اور نیزوں سے جان توڑ کر لڑے اور قلعہ (خدا کی تائید و مہربانی اور آپ کی اقبال مندی اور سپاہیوں کی جان توڑ کوشش سے) فتح ہوا جس کو آپ سے قبل کوئی بادشاہ فتح نہ کر سکا تھا۔ فرشتے کا بیان ہے کہ آپ نے قلعۂ ماہور پر لشکر کشی کی جو کچھ زمانے سے بہمنیوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک زمیں دار کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اگرچہ آپ نے قلعے پر صلح و امان کے ساتھ قبضہ کیا، لیکن پھر بھی اس زمیں دار کے پانچ چھ ہزار آدمی اس جنگ میں کام آئے۔ برہان مآثر کی روایت بہ نسبت فرشتے کی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

فتح قلعۂ ماہور کے بعد اسی سال آپ شمال میں قلعۂ کلم[1] کی طرف بڑھے، جو ایک باغی گونڈ کے قبضے میں تھا۔ یہ قلعہ ایک ہی حملے میں فتح ہو گیا۔ فتح کے بعد آپ نے وہاں کئی مسجدیں تعمیر کرائیں اور ان میں موذن امام مقرر کر کے مساجد میں روشنی کا معقول انتظام کرایا۔ بہ قول فرشتہ آپ نے قلعۂ کلم پر قبضہ کر کے الماس کی کان کو جو حاکم گونڈوانہ کے تحت تھی حاصل کی۔ برہان مآثر کا بیان ہے کہ آپ نے قلعۂ کلم اور ماہور کو ایک ہی یورش میں فتح کیا جن کو فتح کرنے کی آپ سے پہلے کسی بادشاہ کو توفیق نہیں ہوئی تھی۔

---

[1] کلم جنوب مشرقی برار کا مشہور تاریخی قلعہ ہے ایک زمانے میں ضلع کا صدر مقام تھا لیکن اب (ضلع ایوت محل میں) ایک چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اس کے بعد تقریباً ایک سال تک آپ نے ایلچپور[1] میں قیام کرکے قلعۂ گاویل[2] کو از سر نو بنایا، اور قلعہ نرنالہ[3] کی مرمت کی۔ یہ دونوں قلعے گجرات، مالوہ اور خاندیس کی سرحد پر واقع تھے۔ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ مالوہ، خاندیس اور گجرات کو فتح کریں، جنھیں امیر تیمور نے آپ کے بھائی فیروز شاہ بہمنی کو عطا کیے تھے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا خیال راجۂ بیجانگر کا معقول تدارک کرنے کا تھا جو ہمیشہ تنگ کیا کرتا تھا۔

جب یہ خبر ہوشنگ شاہ[4] والیِ مانڈو (مالوہ) کو معلوم ہوئی تو اس نے ۸۳۳ھ م ۱۴۲۸ء میں نرسنگ[5] والیِ کھیرلا کو جو سلطنت بہمنیہ کا باجگذار تھا اپنی اطاعت کے لیے لکھا، اور جب اس نے نہ مانا تو والیِ خاندیس کی رائے سے دو مرتبہ اس پر حملہ کیا، اور دونوں مرتبہ شکست کھا کر بھاگا، اور اپنی ناکامیوں سے غصے میں آکر تیسری مرتبہ ایک بڑا جرار لشکر اپنے معتمد اُمراء کے تحت روانہ کیا۔ ان امیروں نے نرسنگ کے مُلک کو تباہ و ویران کرکے بہت سے پرگنوں اور قریوں پر قبضہ کرلیا۔ نرسنگ نے اور زیادہ فوج جمع کرنی شروع کی۔ یہ خبر معلوم کرکے ہوشنگ شاہ خود اپنی باقی فوج کے ساتھ آیا،

---

[1] ۔ ایلچپور، برار کا مشہور تاریخی مقام ہے۔ بہمنی سلاطین نے یہاں ایک دار العلوم قایم کیا تھا، لیکن اب ویران پڑا ہے۔

[2] ۔ گاویل، برار کا بہت مستحکم قلعہ تھا، اب ضلع امراؤتی میں ویران پڑا ہے۔

[3] ۔ نرنالہ شمالی برار کا ایک اور وسیع و مستحکم قلعہ تھا۔ اب اکولا کے ضلع میں واقع ہے، لیکن ویران ہو جانے کے باوجود یہاں مسلمان بادشاہوں کی بہت سی یادگاریں سلامت ہیں۔ خاص کر آب رسانی کے حوض اور زمین دوز نل نہایت ہنرمندی سے بنائے گئے تھے اور ان کے بعض حصّے اب تک محفوظ ہیں۔ (از حواشی تاریخ مترجمۂ فرشتہ جلد سوم مولفۂ سید ہاشمی صاحب)۔

[4] ۔ فرشتہ، لیکن برہان مآثر نے اس بادشاہ کا نام الپ خان لکھا ہے، اور مانڈو مالوہ کا تاریخی شہر ہے۔

[5] ۔ کھیرلا، برار کے شمال میں شہر بیتول کا مشہور قلعہ تھا۔

اور حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ راجہ نے آپ کے پاس ایلچی کے ذریعے عرضداشت[1] روانہ کی کہ سلطان احمد شاہ ہوشنگ شاہ والیٔ مالوہ کثیر لشکر کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا ہے اور وہ سلطان فیروز شاہ کا ولی بہمنی کی فتوحات مطیع ہوا تھا اس لیے سب لوگ اس کو آپ کا باجگذار جانتے ہیں، پس امداد اور معاونت کرنے میں کسی طرح کا پس و پیش نہ کرکے جلد مدد کی جائے۔ آپ نے اسی وقت عبدالقادر[2]

---

[1] فرشتہ۔ اس کے برہان مآثر کا بیان ہے کہ کلم فتح کرنے کے بعد آپ بیجانگر کی فتح کے لیے روانہ ہوئے اور رجب بیجانگر فتح کرکے بیدر واپس تشریف لائے تو آپ کو نرسنگ والیٔ کھیرلا کی عرضداشت ملی جس میں آپ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اقرار کرکے لکھا تھا کہ آپ اس کی مدد کرکے اس کو اس کے ملک والوں کو سرفراز فرمائیں۔

[2] فرشتہ۔ لیکن برہان مآثر کے بہ موجب عبدالقادر خان جہاں کو روانہ نہیں کیا گیا بلکہ آپ نے نرسنگ کی عرضداشت سے مطلع ہوکر ایک کثیر لشکر کے جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا اور بہ موجب حکم ممالک محروسہ سے اطراف واکناف سے اُمراء، وزراء، شہزادے اور سپہ دار اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ حاضر دربار ہوئے۔ آپ خود ایک کثیر لشکر کے ساتھ کھیرلا کی طرف روانہ ہوکر اس کے نواح میں قیام فرمائے تو اس وقت آپ کو اطلاع ملی کہ نرسنگ نے آپ سے عہد شکنی اور بے وفائی کرکے الپ خاں والیٔ مالوہ سے مل گیا ہے اور معاہدہ کیا ہے کہ اگر وہ اس کی مدد کے لیے اس کی سرحد پر آئے گا تو وہ اس کو ایک لاکھ تنکہ دے گا پس الپ خاں اسلامی قوانین اور ایمان کو بھول کر اس کی مدد کے لیے ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوکر کھیرلا میں پہنچا تو آپ مصلحتاً دو تین منزل اپنے ہی علاقے میں ہٹ آئے، اس خیال سے کہ اگر الپ خاں بھی مسلمانوں سے لڑنے کے بجائے لوٹ جائے تو مسلمانوں کی جانیں اور جائیدادیں یقینی طور پر بچ جائیں گی اگر وہ وسوسۂ شیطانی سے دھوکا کھاکر ملکِ دکن پر چڑھ آئے گا تو واپس آکر آپ اپنی تلوار سے ایسے خیال کو اس کے دماغ سے نکال دیں گے جب اُمراء، روساء اور سپاہ آپ کے اس ارادے سے آگاہ ہوئے تو ان سب نے دشمن کے سامنے سے واپس ہوجانے کے متعلق آپ سے یہ عرض کرنے کی جرأت کی کہ آپ کا لوٹ جانا دشمن کے لیے باعثِ جسارت ہوگا، اس لیے بہتر ہے تھوڑی دیر ٹھیر کر ممکنہ کوشش کے ساتھ الپ خاں کا مقابلہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ دشمن کو شکست ہوجائے۔ آپ ان کے معروضے پر التفات نہ کرکے اپنی مملکت کی طرف واپس تشریف لائے۔ جب اس کی خبر الپ خاں کو ملی تو وہ اس کو آپ کے خوف پر محمول کرکے آپ کے تعاقب میں نکلا۔

سلطان احمد شاہ بہمنی کی فتوحات

سپہ لشکر وطرفدار برار کو حکم دیا کہ لشکر جمع کر کے نرسنگ کی مدد کی جائے اور خود بھی چھ ہزار سواروں کے ساتھ سیر و شکار کرتے ہوئے ایلچپور تشریف لے گئے۔ ہوشنگ شاہ نے قتل وغارت کے بعد کھیرلا کا محاصرہ کیا۔ آپ دو مہینے تک بغیر مقابلے کے ایلچپور میں مقیم رہے، ہوشنگ شاہ نے اس کو آپ کی کمزوری پر محمول کر کے لاف وگزاف کرنا شروع کیا، آپ یہ خبر سنکر ایلچپور سے کھیرلا تشریف لے گئے، مگر ملا عبد الغنی صدر اور نجم الدین مفتی وغیرہ علماء نے جو آپ کے ساتھ تھے آپ کو جنگ پر آمادہ دیکھ کر کہا کہ اب تک شاہان بہمنیہ نے مسلمانوں سے جنگ نہیں کی، اس میں بڑی بدنامی ہے، لوگ کہیں گے کہ ایک غیر مسلم کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کی۔ آپ پر علماء کے اس کہنے کا بہت اثر ہوا اور مسلمانوں سے لڑنا مناسب نہ سمجھ کر اپنی فوجیں ہٹالیں[۱] اور ایلچی بھیج کر ہوشنگ شاہ سے کہلا بھیجا کہ نرسنگ ہمارا باجگذار رہے، اس سے پرخاش نہ کیجئے تاکہ ہم اور آپ دونوں مسلمان آپس میں نہ لڑیں لیکن ہوشنگ شاہ نے اس کو آپ کے عجز پر محمول کر کے اور یہ سمجھ کر کہ آپ کا لشکر پندرہ ہزار ہے، اور اس کے ہمراہ تیس ہزار سوار ہیں آپ کا تعاقب[۴] اس طرح کیا کہ جس منزل سے آپ کوچ کرتے تھے وہ اس مقام میں فروکش ہوتا تھا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اس طرح کام بگڑتا ہے تو آپ نے علماء[۵] کو طلب کیا اور ان سے فرمایا کہ میں آپ کے فتوے شریف پر جہاں تک ممکن تھا

۱و۲و۳۔ یہ واقعات فرشتے میں مذکور ہیں، برہان مآثر میں نہیں۔

۴۔ فرشتہ اور برہان مآثر میں یہ واقعہ اسی قدر اضافے کے ساتھ ہے کہ آپ کو اپنے علاقے میں دو تین منزل طے کرنے کے بعد ایلچیوں نے اطلاع دی کہ الپ خاں اس طرح شاہی لشکر کا تعاقب کر رہا ہے اور لشکر اسلام سے جنگ کا اصرار کرتا ہے۔

۵۔ فرشتہ۔ مگر برہان مآثر نے اس کو اس طرح پر لکھا ہے:۔ آپ نے مشایخ، علماء اور فضلاء کو طلب کر کے دریافت فرمایا کہ "جب کبھی ایک مسلمان بادشاہ ایک غیر مسلم کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کرے تو اس سے مقابلہ کرنا از روئے شریعت جایز ہے یا نہیں"۔ علماء نے جواب دیا کہ غیر مسلموں کے حمایتیوں سے لڑنا بمنزلہ جہاد کے سب پر ایسا واجب ہے جیسا کہ ایک

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

عمل کیا اور جو بے غرضی اب تک برداشت کی رہ بہت ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کل یہاں سے کوچ کر کے دریائے تاپتی[1] کے کنارے جا کر مقیم ہو جاؤں جو میری ریاست کی سرحد ہے اور جو شخص بلا امتیاز مذہب و ملت وہاں میرے مقابل آئے گا میں اس سے لڑوں گا، ظاہر ہے کہ میں بھی مسلمان فرمانروا ہوں، کوئی مسلمان حریف زبردستی میرے مقابل بن آئے تو خود وہ حریف خدائی باز پرس کا باعث ہوگا نہ کہ میں۔ ایسے معرکہ میں مسلمانوں کے خون کا وبال اس کی گردن پر ہوگا نہ کہ میری۔" علماء نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا۔ آپ نے دوسرے دن اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور چار سو جنگی ہاتھی جو جنگ آزما اور مست تھے جا بجا متعین کئے، اور شاہزادہ علاء الدین کو چتر سیاہ دے کر قلب میں اور میمنہ[2] پر خان جہاں عبد القادر کو اور میسرہ پر عبد اللہ خاں نبیرہ اسمٰعیل مغ کو کھڑا کیا، اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) دین دار مسلمان کی مدد اور تائید کرنی۔" آپ نے علماء سے فتوے حاصل کرنے کے بعد امراء اور سپہ داروں سے فرمایا کہ واپسی سے میرا منشاء یہ تھا کہ الپ خاں ایک مسلمان بادشاہ ہے، ہمارے لیے جو ہم مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں جائز نہیں ہے کہ جنگ میں مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ مقابلے میں سبقت کریں۔ جو ایسا کرتا ہے وہ خدا کا گنہگار ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: الفتنۃ نائمۃ لعن اللّٰہ من انقظہا اس لیے ہم اپنے ملک کی طرف لوٹے تھے کہ اگر الپ خاں ہمارے علاقے میں داخل ہوگا تو ہم اس کے ساتھ جنگ میں سبقت کی تحریک کرنے والے نہیں ہوں گے، کیونکہ اب جب کہ وہ جسارت کر کے ہمارے ملک میں آیا تو ہم پر اس کی تنبیہ کرنی لازمی ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے لشکر میں تشریف لے جا کر اپنی فوجوں کو بہادری وجواں مردی سے لڑنے کی ترغیب و تحریص دے کر انھیں دشمن کے مقابلے میں آراستہ کیا۔

[1] ۔ فرشتہ، برہان مآثر اور دیگر تواریخ سے اس دریا کے نام کا پتہ نہیں چلتا کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم میں اس دریا کا نام تاپتی لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کا مآخذ کونسی تاریخ سے ہے۔

[2] ۔ یہ تفصیل فرشتے نے دی ہے لیکن برہان مآثر میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

آپ نے خود دو ہزار[1] منتخب سپاہ اور بارہ جنگی ہاتھیوں کو ساتھ لے کر بائیں جانب کمین گاہ میں قیام کیا۔ لڑائی شروع ہوئی، ہوشنگ شاہ پہلے ہی گھمنڈ میں تھا، یہ نہ معلوم تھا کہ آج دوسری حالت ہے، وہ سترہ ہزار آدمیوں سے بڑھا چلا آیا۔ آپ نے کمین گاہ سے خود دو ہزار مسلح آدمیوں اور بارہ جنگی ہاتھیوں سے اس کا شدید مقابلہ کیا۔ مالوی فوجیں نہایت بہادری سے لڑیں لیکن آخر میں ہوشنگ شاہ سخت شکست کھا کر بھاگا۔ رائے کھیرلا[2] محاصرے سے نکلا اور تعاقب کرکے اس کو راستے میں اور بھی غارت کیا۔ اس وقت ہوشنگ شاہ کے اہل وعیال اور دو سو جنگی ہاتھی آپ کے ہاتھ آئے۔ آپ کو مسلمانوں کی اس خونریزی کا بے حد رنج ہوا۔ آپ نے ہوشنگ شاہ کے اہل وعیال کی بے حد عزت اور خاطر داری کی اور انھیں نہایت اعزاز سے اپنے پانچ سو معتبر سواروں[3] اور خواجہ سراؤں کے ہمراہ ہوشنگ شاہ کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد نرسنگ[4] مع اپنے بیٹوں کے آپ کی خدمت میں

---

[1] ۔ فرشتے میں اس فوج کی تعداد دو ہزار سوار اور بارہ ہاتھی لکھی ہے۔ لیکن برہان مآثر میں لکھا ہے کہ آپ کے ساتھ ڈھائی ہزار زرہ پوش نیزہ باز سوار تھے۔

[2] ۔ یہ تفصیل فرشتے نے دی ہے۔ برہان مآثر کی دی ہوئی تفصیل اس سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، اس لیے بیان نہیں کی گئی۔ نرسنگ کے محاصرے سے نکل کر شاہ مالوہ کے تعاقب کرنے کا ذکر برہان مآثر میں نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ جنگ صبح سے شام تک جاری رہی۔ الپ خاں اور اس کی فوجوں نے جان توڑ کوشش کی، مگر انھیں شکست ہوئی اور وہ ہاتھی گھوڑے بارگاہ خیمہ سرا پردہ خواب گاہ حرم، خدام اور تمام لوازمات شاہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آپ کی فوج الپ خاں اور اس کی فوج کا تعاقب کرنا چاہتی تھی، لیکن آپ نے اس کو منع فرمایا اور حاصل شدہ مال غنیمت کو اپنی افواج میں تقسیم کر دیا۔

[3] یہ تعداد ہفت اقلیم اور برہان مآثر کی دی ہوئی ہے۔ فرشتے نے تعداد نہیں دی ہے، لیکن واقعہ کو ایسا ہی بیان کیا ہے جیسا کہ ہفت اقلیم اور برہان مآثر نے۔

[4] یہ واقعہ فرشتے نے بیان کیا ہے، لیکن برہان مآثر اس کے بالکل خلاف لکھتا ہے کہ آپ نے

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

حاضر ہو کر اپنے ساتھ کھیرلا لے گیا اور بڑی دھوم سے دعوت کی، اور گراں بہا ہدیئے اور تحفے آپ کی خدمت میں پیش کیے جس میں ایک من الماس، یاقوت، اور سچے موتی تھے۔ نرسنگ نے اُمرا، کی بھی بہت خاطر و مدارات کی اور ماہور تک آپ کے ہمرکاب آیا اور ماہور سے شاہی خلعت سے سرفراز ہو کر مع اپنے بیٹوں کے کھیرلا واپس گیا، اور آپ اپنے دارالسلطنت کو واپس تشریف لے گئے۔

طبقات اکبری، ہفت اقلیم اور تاریخ مالوہ[1] میں اس جنگ کا واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ آپ نے قلعۂ کھیرلا کا محاصرہ کیا۔ رائے کھیرلا نے سلطان ہوشنگ کو اپنی مدد کے لیے اس شرط پر بلایا کہ وہ اس کے روزانہ خرچ کے لیے تین لاکھ تنکہ دیا کرے گا۔ جب ہوشنگ شاہ نزدیک پہنچا تو آپ قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر تین منزل پیچھے ہٹے۔ ہوشنگ شاہ نے اس پر قناعت نہ کر کے تین منزل تک آپ کا تعاقب کیا اور آپ اس بے عزتی کو برداشت نہ کر کے پلٹے جس کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں میں لڑائی ہوئی جس کا نتیجہ وہی ہوا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) نرسنگ کے تمام علاقے پر ماہور تک قبضہ کر کے شاہزادہ محمود خاں کو جاگیر میں دے دیا۔ اور یہ علاقہ شاہزادے کے قید ہونے تک برابر اسی کے قبضے میں قایم رہا۔ آپ الپ خاں کی جنگ سے فارغ ہو کر بیدر تشریف لے گئے (از انگریزی ترجمہ برہان مآثر مترجمہ میجر کنگ۔ برہان مآثر نسخۂ مولوی عبدالحق صاحب میں جہاں یہ واقعہ مذکور ہے وہاں کے الفاظ بالکل اُڑ گئے ہیں کچھ پڑھا نہیں جاتا اور اس کے بعد کے دو صفحات تو بالکل ہی سفید ہیں)۔

[1] تاریخ مالوہ کا حوالہ فرشتے نے دیا ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

فرشتے کا بیان ہے کہ آپ نے ۸۳۳ھ م ۱۴۲۹ء میں ملک التجار

لہ۔ اسی واقعہ کو برہان مآثر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فتح کلم کے بعد ۸۳۰ھ م ۱۴۲۶ء میں ملک التجار خلف حسن بصری کو ایک بہادر اور جرار فوج کے ساتھ کوکن روانہ کیا۔ خلف حسن بصری نے لشکر کے ساتھ کوکن اور بندرگاہوں میں جاکر کافروں کے مکانات اور عمارات کی بیخ کنی کی۔ اور ہر طرف لوگ اس کے حملے کی خبر سن کر پریشان پھر رہے تھے۔ اس نے اس ملک کے کئی قلعے اور شہر فتح کیے اور اپنی بہادری اور نیک نامی کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ آپ نے اس کو شاہانہ عنایات سے سرفراز فرمایا جس کی وجہ سے دکنی اس سے رشک و حسد اور مخالفت کرنے لگے لیکن ان میں اس کو نقصان پہنچانے کی قوت نہیں تھی اس لیے شاہانہ عنایات کی وجہ سے اس کی دولت میں اضافہ ہونے لگا اور اس نے ملک کوکن میں داخل ہو کر تمام قلعے، شہر، بندرگاہ اور پہاڑ فتح کرکے جزیرۂ مہائم پر بھی حملہ کرکے فتح کیا جو شاہان گجرات کے ماتحت تھا۔ وہاں کے باشندوں نے شاہِ گجرات سے شکایت کی اس لیے شاہ گجرات نے ایک کثیر فوج اپنے ولی عہد محمد شاہ کے تحت خلف حسن بصری کی بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کی۔

آپ نے گجراتی افواج کی آمد کی خبر سن کر اپنے ولی عہد ظفر خاں (جنھیں علاء الدین کا خطاب دیا گیا تھا) کے تحت ایک کثیر فوج ملک التجار کی مدد کے لیے روانہ کی۔ ظفر خاں اپنی فوجوں کے ساتھ جزیرۂ مہایم کی خلیج کے کنارے پر قیام کیا، اور دوسرے کنارے پر محمد شاہ گجراتی اپنی فوجوں کے ساتھ ٹھیرا ہوا تھا۔ تھوڑے عرصے تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے دن تمام جنگ کے لیے تیار کھڑی رہتی تھیں، لیکن خلیج کو پار کرکے لڑنے کی کسی کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی جب اس طرح ایک زمانہ گذر گیا تو دکنی امراء نے حسد کی وجہ سے جو انھیں غیر ملکیوں سے تھی شاہزادہ ظفر خاں سے کہا کہ جنگ میں لڑیں گے اور مریں گے تو ہم لیکن نام خلف حسن بصری کا ہوگا۔ شاہزادہ

خلف حسن بصری کو طرف دار اور سپہ سالار دولت آباد مقرر کر کے اس کو سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نوجوان تھا تجربہ نہ رکھنے کی وجہ سے ان مکار دکنی اُمرا کی بے ایمانی اور بدخواہی کو نہ سمجھا، اور ان کی عیارانہ چالوں میں آگیا اور خلف حسن بصری کو نہایت پریشانی اور ذلت کی حالت میں چھوڑ کر اپنے لیے ایک بدنامی مول لی۔ جب گجراتی افواج کو اس سازش کی خبر ملی تو وہ اپنی فتح کا یقین کر کے خلف حسن بصری پر حملہ آور ہوئیں۔ خلف حسن بصری بغیر فوج کے اُن کے حملے کو روک نہیں سکتا تھا اس لیے اُس کو مہایم چھوڑنا پڑا۔ اور گجراتی افواج نے اُس کے لشکر کو لوٹا اور اس کے بھائی حسین بن حسن کو قید کر کے گجرات کی راہ لی۔

جب یہ خبر آپ کو ملی تو آپ نے خود جا کر دشمن سے بدلہ لینے کے لیے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ پس بہ موجب حکم اُمرا اور سپہ سالار اضلاع، قلعوں، شہروں اور جاگیروں سے اپنی اپنی فاتح فوجوں کے ساتھ بیدر میں جمع ہوئے اور آپ نے اس کثیر لشکر کے ساتھ فتح گجرات کے لیے روانہ ہو کر قلعۂ بہول پر جو دکن اور گجرات کی سرحد پر واقع تھا قیام فرمایا۔ آپ کے بہادر لشکریوں نے قلعۂ بہول والوں کی رسد کو روکا اور قلعے کے محاصرے میں مشغول ہوئے۔ اس قلعے کا حاکم غیر مسلم تھا۔ اس نے مضبوط قلعے کے زعم اور سلطان احمد گجراتی کی حمایت کی توقع پر جس کا وہ قدیم الایام سے مطیع و فرماں بردار تھا، ایک خط اس مضمون کا اس کے پاس روانہ کیا کہ آپ گجرات کے راستے میں اس کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ لکھا کہ اگر سلطان اپنی عنایت و مہربانی سے اس کو مہلک مصائب سے نجات دلائے گا تو وہ سالانہ ایک کثیر رقم شاہی خزانے میں داخل کیا کرے گا۔ اس وجہ سے سلطان احمد گجراتی قلعہ بہول کے غیر مسلم حاکم کی امداد کے ارادے سے ایک کثیر لشکر کے ساتھ روانہ ہو کر ایک ہی منزل طے کر کے قلعہ بہول پہنچ گیا۔ جب آپ کو دشمن کے آنے کی اطلاع ملی تو محاصرے سے ہاتھ اُٹھا کر اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے۔ دونوں فوجیں دریا کے کنارے پہنچ کر ایک دوسرے کے مقابلے میں ٹھیریں، اور ان دونوں کے درمیان دریا ہی حائل تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

قلعہ کوکن[لہ] کے باغیوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ اس نے تھوڑے عرصے میں کل مفسدین کا بہترین طریقے پر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ہر روز دونوں طرف کی فوجیں آراستہ ہو کر ایک دوسرے کے مقابل میں کھڑی ہوتی تھیں، اور دونوں طرف کے بہادر سپاہی دریا کو عبور کر کے لڑنا اور دادِ مردانگی حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن دونوں بادشاہ انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے تھے اور مسلمانوں کی خوں ریزی پر راضی نہ ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ تقریباً ایک سال تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابلے میں جنگ کے خیال سے ٹھیرے رہے لیکن کسی نے بھی جنگ کی ابتداء نہیں کی جب ایک مدت اس طرح گذر گئی تو دونوں طرف کے علما، و فضلا، درمیاں میں آئے اور انھوں نے اپنے وعظ اور نصیحتوں سے جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کیا، اور دونوں فرماں رواؤں میں صلح کرا دی جس کی رو سے طے پایا کہ قلعہ بھول جو ایک زمانے سے گجرات کے قبضے میں تھا، اب بھی اسی طرح اس کے گماشتوں کے ماتحت رہے گا! اور جو کچھ آپ کا ہے وہ آپ کے ماتحت رہے گا۔ اور چند روز بعد دونوں بادشاہوں میں معاہدہ صلح و دوستی ہو کر جھگڑے اور دشمنی کا خاتمہ ہوا جس کی رو سے طے پایا کہ وہ ملکی و دینی اور ملک و ملت کے دشمنوں کے دفع کرنے میں ایک دوسرے کے مدد و معاون رہیں گے اور اسلام کے جھنڈے کو بلند کرنے اور کافروں کے رسوم کے دفع کرنے میں وہ اپنی طرف سے کبھی کوتاہی نہ کریں گے۔ دونوں مسلمان فرماں روا شرایط صلح پر راضی ہو کر ایک دوسرے کو کئی تحفے اور ہدیے بھیجے۔ اور تقریباً سو سال تک ان دونوں میں رابطہ دوستی و محبت قایم رہا، اور سلسلۂ خط و کتابت اور تحایف بھی جاری رہا۔ پس مستقل صلح کی گفت و شنید کے بعد آپ دارالسلطنت بیدر کی طرف روانہ ہوئے۔

تاریخ فرشتہ کے مولف نے اس جنگ کے جو حالات تاریخ محمود شاہی کے حوالے سے بیان کیے ہیں اس سے حسب بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔

لہ۔ کوکن دریائے عمان کے ساحل پر واقع تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

علاج کرکے ملک کو فتنہ و فساد سے پاک وصاف کردیا، اور روپیہ اور اشرفیاں ہاتھیوں پر لاد کر آپ کی بارگاہ میں گذرانیں۔ آپ نے اس کی کارگذاری سے خوش ہوکر اس کو خلعتِ خاص، کمر بند اور شمشیرِ مرصع مع دیگر شاہی عنایات کے سرفراز فرمایا جو کسی نے اپنے ملازم کو اس قدر عنایت نہیں کیا تھا۔ خلف حسن بصری نے باغیوں کی بیخ کنی کے سلسلے میں جزیرہ ٔ مہایم[1] پر بھی قبضہ کرلیا جو سلطنتِ گجرات کے ماتحت تھا، اس لیے سلطنتِ بہمنیہ اور سلطنتِ گجرات میں جنگ ہوئی۔

فرشتہ شاہانِ گجرات کے واقعات میں اس جنگ کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ۸۳۳ھ م ۱۴۲۹ء میں راجہ کانھا رائے جالوارہ کو جب یقین ہوگیا کہ احمد شاہ والیٔ گجرات ایدر کی فتح کے بعد اس کے علاقے پر چڑھائی کیے گا تو اس نے اپنی بہتری جلاوطنی میں دیکھی۔ جب یہ خبر احمد آباد میں پہنچی تو ایک فوج اُس کے تعاقب میں روانہ کی گئی۔ راجہ کانھا افتاں وخیزاں آسیر و برہان پور میں پہنچا اور دو ہاتھی یہاں کے حاکم نصیر خاں کی خدمت میں پیش کیے اور اس کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ نصیر خاں نے ظاہراً اس کی مدارات کی، تاہم احمد شاہ گجراتی کے مقابلے کی طاقت اپنے میں نہ دیکھ کر آپ کے پاس ایک سفارشی خط دے کر اس کو بھیج دیا۔ آپ نے کچھ فوج اس کی مدد کو دے کر گجرات کو روانہ کیا جس نے ندربار اور سلطان پور کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ اس لیے احمد شاہ گجراتی نے اپنے ولی عہد محمد خاں کو لشکر دے کر بھیجا اور مقرب الملک سپہ سالار اور افتخار الملک سید ابوالخیر اور سید ابوالقاسم اور سید عالم وغیرہ سرداروں کو ساتھ کیا۔ ندربار کے قریب گجراتی اور دکنیوں میں جنگ ہوئی۔ دکنی شکست کھاکر بھاگے اور دولت آباد میں آکر پناہ لی۔ جب یہ خبر آپ کو ملی تو آپ نے اپنے ولی عہد شہزادہ علاء الدین اور قدر خاں سرلشکر کو روانہ کیا۔

---

[1] مہایم (دکلوی مہایم) بمبئی کے تقریباً پچاس میل شمال میں ساحل پر واقع ہے اور اسلامی بادشاہوں کے زمانے میں مشہور شہر تھا۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب اور میجر کنگ نے اس کو خاص جزیرہ بمبئی کا قدیم نام قرار دیا ہے۔

سلطان احمد شاہ جب یہ لوگ دولت آباد آئے تو علاء الدین ناصر نصیر خاں اور راجہ کانھا رائے جالو ا رجی دلی بہمنی کی فتوحات آ کر مل گئے جوں ہی یہ متفقہ فوج گھاٹی مانک تک پہنچی تو بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ قدر خاں اور مقرب الملک دونوں سپہ سالار اتفاقاً ایک دوسرے سے مقابل ہو گئے۔ قدر خاں گھوڑے پر سے گر پڑا۔ ملک افتخار الملک نے خاص شہزادہ علاء الدین پر حملہ کر کے شہزادے کے افواجِ خاصہ کو شکست دے کر بڑے بڑے ہاتھیوں کو لوٹ لیا جس سے دکنیوں کو بڑا نقصان پہنچا اور میدان میں نہ ٹھہر سکے۔ نصیر خاں اور راجہ کانھا علاقۂ کلند کی طرف بھاگ گئے۔ دکنیوں نے دولت آباد کا راستہ لیا، مگر اسی سال ۸۳۴ھ م ۱۴۳۰ء میں قطب نامی حاکمِ جزیرۂ مہایم جو گجرات کے ماتحت تھا مر گیا۔ آپ اس شکست کی تلافی کی فکر میں تھے یہ موقعہ ملتے ہی ایک فوج خلف حسن بصری کے تحت روانہ کی جس نے آپ کے حکم سے جزیرۂ مہایم پر قبضہ کر لیا۔

جب یہ خبر گجرات پہنچی تو سلطان احمد گجراتی نے اپنے چھوٹے بیٹے ظفر خاں کو افتخار الملک کی اتابکی میں استرداد مہایم کے لیے بھیجا، اور مخلص الملک کو توالِ بندر دیو کو بھی اعانت کے لیے لکھا۔ چنانچہ مخلص الملک سترہ جہازوں کا بیڑا لے کر دریا سے اور ظفر خاں خشکی کی طرف سے تھانہ کو چلے جو دکنیوں کے قبضے میں تھا۔ افتخار الملک سر لشکر اور ملک سہراب سلطانی نے شہزادے سے پہلے آکر محاصرہ کیا، اور جہازوں نے رسد روک دی گو پھر بھی حاکم تھانہ خوب لڑا اور آخر قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شہزادہ تھانہ میں فوجیں مقرر کر کے مہایم کو روانہ ہوا۔ ملک التجار خلف حسن بصری مہایم میں تھا جہاں ساحل کی طرف اس نے کانٹے لگا دیے تھے۔ جب شہزادہ ظفر خاں مع لشکر کے وہاں آیا تو طرفین میں صبح سے شام تک خوب لڑائی ہوئی۔ ملک التجار خلف حسن بصری شکست کھا کر وہیں کسی دوسرے جزیرے میں چلا گیا اور وہاں سے آپ کو مدد کے لیے لکھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے چھوٹے شہزادہ محمد خاں اور خواجہ جہاں وزیر کو دس ہزار سوار اور ساٹھ ہاتھی کے ساتھ مدد کے لیے روانہ کیا۔ جب شہزادہ اپنے لشکر کے ساتھ آیا تو ملک التجار خلف حسن بصری محاصرے سے نکل کر شہزادے سے ملا اور بعد مشورے کے دکنی تھانہ کو روانہ ہوئے۔ ظفر خاں بھی وہاں پہنچا۔ پہلے دن صبح سے

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

شام تک دونوں لڑتے رہے، مگر دکنیوں کو شکست ہوئی اور ملک التجار خلف حسن بصری کا بھائی حسین بن حسن گرفتار ہوا اور دو دکنی سردار مارے گئے اور ملک التجار خلف حسن بصری چاکنہ[1] میں اور محمد خاں دولت آباد میں لوٹ آئے۔ ظفر خاں نے مہایم میں آکر اپنا انتظام کیا اور جو دکنی دریا میں بذریعہ جہاز بھاگ گئے تھے ان کو گرفتار کیا اور بہت سا لوٹ کا مال باپ کے پاس بھیجا۔

اس شکست کی خبر سُن کر آپ کو غصہ آیا اور آپ تمام فوج لے کر ۸۳۵ھ م ۱۴۳۱ء میں گجرات کی طرف روانہ ہوئے اور بگلانہ پہنچ کر اس علاقے کو آپ نے تاراج کیا۔ یہاں کا راجہ قلعے میں محصور ہو گیا۔ شہزادہ محمد خاں نے جو اس وقت سرحدِ گجرات کی حفاظت پر مامور تھا، باپ کو اس کی اطلاع دی اور فوراً ندربار میں آیا۔ آپ بیتول سے اس کے آمد کی خبر سُن کر اپنے دار السلطنت کو واپس ہوئے۔ جب اس کو یہ اطلاع ملی کہ آپ بیتول سے واپس ہو گئے ہیں تو وہ بھی احمد آباد کو لوٹا۔ لیکن پھر یہ خبر ملی کہ آپ بیتول کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور وہاں کا حاکم ملک سعادت سلطانی محصور ہے تو وہ پھر واپس آیا، اور کہلا بھیجا کہ اگر آپ محاصرہ اُٹھا کر چلے جائیں تو دوستی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔ آپ نے اپنے اُمراء سے اس بارے میں مشورہ کیا جنھوں نے اپنے غرور میں اپنی طاقت کا اندازہ نہ کر کے لڑنے کا مشورہ دیا اور قلعے کی فتح میں عجلت سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلعے پر بہت سے آدمی مارے گئے اور سلطان احمد شاہ گجراتی کے آنے پر محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ آپ نے اپنے سرداروں سے فرمایا کہ ہم کو کئی مرتبہ شکست ہو چکی ہے، اگر یہاں بھی شکست ہوئی تو دکن کی حکومت ہم سے جاتی رہے گی، اس لیے جان توڑ کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ نے اپنی فوجوں کو درست کیا اور سلطان احمد گجراتی نے اپنی افواج کی ترتیب شروع کی، دونوں میں جنگ شروع ہوئی۔

---

[1] چاکنہ پونا کے بیس پچیس میل شمال میں ایک مضبوط پہاڑی قلعہ ہے۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

لڑائی کے شروع میں دکنیوں کی طرف سے ایک امیر مسمی اثر درخاں نکلا اور اپنے مقابلے کے لیے کسی کو طلب کیا۔ گجراتیوں میں سے عضد الملک آگے بڑھا اور دونوں سرداروں نے ایک دوسرے پر حملہ کیا، مگر اثر درخاں مغلوب ہو کر قید ہو گیا۔ اس پر طرفین کے لشکر بھڑ گئے اور شام تک خوب لڑتے رہے۔ لیکن دکنیوں کو شکست ہوئی اور ان کا بڑا نقصان ہوا۔ اور بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس لیے رات کو وہاں سے کوچ کر کے آپ اپنے دارالسلطنت بیدر کو واپس ہوئے۔

تاریخ فرشتہ نے تاریخ الفی اور بہمن نامے کے حوالے سے اس جنگ کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے اور طبقات اکبری سے حسب بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن فرشتے کا بیان ہے کہ سراج التواریخ بہمنی میں اس محاصرے کے قصے کو اور طرح پر لکھا ہے مختصر یہ کہ جب محاصرہ کیے ہوئے دو سال کی مدت گذر گئی تو سلطان احمد گجراتی نے بہ طریق رفق و مدارا آپ سے استدعا کی کہ قلعہ اس کو دے دیا جائے۔ جب آپ نے اس کی استدعا کو قبول نہ فرمایا تو اس نے اپنی سرحد سے کوچ کر کے دکن میں تاخت و تاراج شروع کی۔ اس پر آپ نے محاصرہ اٹھا لیا۔

اس موقع سے فایدہ اٹھا کر اپنی سابقہ شکست کا بدلہ لینے کے لیے ہوشنگ شاہ[1] والی مالوہ نے ۸۳۶ھ م ۱۴۳۳ء میں فوج لے کر قلعۂ کھیرلا پر چڑھائی کی اور نرسنگ رائے کو قتل کر کے کھیرلا پر قبضہ کر لیا۔ جب آپ کو اس کی خبر ملی تو مالوے والوں سے مقابلہ کرنے کے لیے بڑھے۔ مگر نصیر خاں والئ اسیر نے دونوں بادشاہوں میں صلح کرا دی جس کے بہ موجب برار آپ کے قبضے میں رہا اور کھیرلا ہوشنگ شاہ کو دے دیا گیا۔

برہان مآثر کے مولف نے اس واقعے کو اس طرح لکھا ہے کہ والی مانڈو (مالوہ) سے قلعۂ کھیرلا کے متعلق جھگڑا ہوا۔ آخر بڑے جنگ و جدال کے بعد صلح ہو گئی جس کے بہ موجب قلعۂ کھیرلا والئ مانڈو کو دے دیا گیا، اور قلعے کے اس طرف کا علاقہ ممالکِ محروسہ میں شامل

---

[1] فرشتہ۔

کرلیا گیا۔ اس کے بعد دونوں فرماں رواؤں میں دوستی اور موافقت کے عہد وپیمان ہوئے (جو سلطان احمد شاہ ان کی اولاد کے زمانے میں مخالفت و مخاصمت میں مبدل ہوگئے) اور وہ اپنے اپنے دارالسلطنت کو ولی بہمنی کی فتوحات واپس ہوگئے۔ ان دونوں میں جو دوستانہ تعلقات قایم ہوئے وہ گجرات کے جیسے مستحکم نہ تھے۔

جس زمانے میں آپ گجرات اور مالوہ کی جنگوں میں مشغول تھے، اس موقع کو غنیمت خیال کرکے غیر مسلم[1] دشمنوں نے ہر طرف اپنے اپنے علاقوں میں بغاوتیں کیں اور مملکت کے اطراف واکناف کے قلعے، شہر اور سرحدی مقامات کے باجگذار گماشتوں نے بھی سرکشی شروع کی۔ آپ گجرات اور مالوے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مفتوحہ علاقوں کی دوبارہ فتح کی طرف متوجہ ہوئے، جہاں کے غیر مسلم حاکموں نے سرکشی شروع کی تھی۔ ایک کثیر فوج جمع کرکے آپ سب سے پہلے تلنگانے کے سرکشوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ تلنگانے کے کئی علاقے بغیر جنگ کے آپ کے قبضے میں آگئے اور بعض قلعوں اور شہروں نے اطاعت قبول کرکے خراج اور مالگذاری برابر ادا کرنے کا اقرار کیا۔ جن علاقوں نے آپ کی اطاعت قبول نہیں کی ان میں آپ کی فوجوں نے قتل وغارت مچائی۔ خدا کی عنایت، اور آپ کی اقبال مندی سے کئی مضبوط قلعے فتح ہوئے جن میں بہت مشہور اور مضبوط قلعہ رام گیر[2] بھی آپ کے قبضے میں آگیا۔ یہ حالت دیکھ کر والیٔ قلعۂ ورنگل کو فکر ہوئی، اور اس نے اپنے اعیانِ سلطنت سے مشورہ کرکے آپ کی خدمت میں ایک وفد روانہ کیا اور فرماں برداری اور اطاعت کے لیے عرضی گذرانی کہ اگر آپ اس کے قصور کو معاف کردیں گے تو وہ خراج گذرائے گا۔ آپ نے اپنی مہربانی سے قلعے کے رہنے والوں کے قصور کو معاف کردیا، اور ضمانت لے کر فوجوں کو لوٹ مچانے سے منع کیا۔ اسی طرح تلنگانے کے جملہ قلعے اور شہر، جو غیر مسلموں کے قبضے میں تھے آپ کے قبضے اور تصرف میں آئے،

---

[1] برہان مآثر۔

[2] قلعہ رام گیر جنوب مشرقی برار میں واقع تھا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی فتوحات

اور جو حکمران خراج دینا قبول کر کے آپ کے مطیع ہوئے آپ نے ان کے علاقے انھی کے قبضے میں بحال رکھے۔ آپ نے ابراہیم سنجر خاں کو سرلشکر بنا کر اور ایک جرّار فوج اس کے ماتحت دے کر اس علاقے کی حفاظت کے لیے مقرر کیا اور قلعۂ بھونگیر اور بعض اضلاع اس کی جاگیر میں دیے، اس طرح اس علاقے کو فتح کرنے اور اس کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنے دارالسلطنت بیدر کی طرف تشریف لے گئے۔

فرشتے کا بیان ہے کہ ہوشنگ شاہ والیٔ مالوہ سے صلح کرنے کے کچھ عرصے کے بعد آپ کا آخری سفر تلنگانے کی طرف ہوا، اور آپ نے بہت سے زمین داروں کو جنھوں نے شہزادہ داؤد خاں سے سرکشی کی تھی مغلوب کیا۔

عقل کی دوڑ ختم ہو جاتی ہے۔ اب اقبال دل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو طلسموں کو توڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تیسرے بند میں فرماتے ہیں کہ موت ایک امتحان ہے جس میں کامیابی حاصل کرنے والے "بقائے دوام" کی سند پاتے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر بندۂ مومن اپنے اصل مقام تک پہنچ جاتا ہے، جہاں پہنچنے کے بعد عبد اور معبود میں کوئی پردہ حایل نہیں رہتا۔

کیا یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ اس نظم میں "بندۂ مومن" کا اشارہ راس مسعود مرحوم کی طرف ہے، جن کی وفات نے اقبال کے دل پر اس درجہ اثر کیا۔ بالآخر شاعرِ مشرق نے یہ رجائیت آمیز نتیجہ نکالا کہ اصل چیز "خودی" ہے جو غیر فانی ہے۔ سر راس مسعود مرحوم جیسی خودی رکھنے والی ہستیوں کے لیے موت کوئی آفت یا بلا نہیں بلکہ اُن کے جوہر کی تکمیل کا ایک لازمی جزو ہے۔ چنانچہ علامہ مرحوم نے خود اپنی وفات سے قبل بھی یہی فرمایا:—

"میں موت سے نہیں ڈرتا، میں مسلمان ہوں۔"

غور فرمائیے، اس مرثیے میں اقبال محض رونے رلانے اور آہ و زاری کی ترغیب دینے کی بجائے ایک ابدی مسئلے کے بارے میں کیا کہہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود اقبال پر عدم تسلسل اور موضوع سے ہٹ کر بھٹکنے کا الزام عاید کرنے والوں کے متعلق آپ کیا رائے قایم کریں گے؟

اس نظم کو فرمایش کا نتیجہ سمجھنا سراسر غلط ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اقبال مرحوم کی زندگی ہندستان اور خاص کر اسلام کی فلاح کے لیے وقف تھی۔ ہندستان اور مسلمانوں کا نقصان اُن کا اپنا نقصان تھا۔ کیا واقفِ حال اصحاب کے شان و گمان میں بھی یہ خیال آسکتا ہے کہ راس مسعود جیسا محسنِ قوم اور یگانۂ روزگار دنیا سے رخصت ہو جائے تو اظہارِ تاسف کے لیے اقبال جیسے حساس اور صاحب دل شاعر سے فرمایش کرنے کی ضرورت ہو گی۔ اقبال جیسے دردمندوں کا تو ذکر ہی کیا، معمولی دل و دماغ والے انسانوں سے بھی، اُن کے عزیزوں یا خاص دوستوں کی جدائی پر رنج کرنے کے لیے فرمایش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور علامہ اقبال اپنے پیام اور نصب العین سے ہٹ کر کس کی فرمایش کی تکمیل کرنے والے تھے؟ علاوہ بریں عجیب اتفاق ہے کہ اس مرثیے کو فرمایش کا نتیجہ سمجھنے والے

"بزرگوں" کا ذکر خود علامۂ مرحوم اس نظم میں اس طرح کر گئے ہیں:۔

مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی   فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

مزید گل افشانیاں ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں:۔ "افسوس کہ مسعود بھی اپنے تعلیمی تجربات اور عظمت و خودداری کو لے کر موت کی نیند سو گئے۔" اس سے "ادارہ" کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ مسعود مرحوم کی عظمت اُن کی ذات سے وابستہ تھی، جیسے کسی سرکاری افسر کی ہوتی ہے کیوں کہ تنقید شروع اس طرح فرمائی گئی کہ "نواب مسعود جنگ سر راس مسعود مرحوم اسی علمی اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کے کارنامے دنیا پر آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ ... مسعود جنگ کی ذات اپنے نامور دادا سر سید احمد خاں کے جوشِ عمل اور اپنے لائق باپ جسٹس محمود کی ذکاوت و ذہانت کا سنگم تھی۔ ... عثمانیہ یونیورسٹی کی محرابیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے بام و در، درسِ مسعود کے احسان سے جھکے رہیں گے۔ ... قوم میں مفکر اور علمی انسانوں کا قحط ہے، جانے والا، اپنا جانشین چھوڑ کر نہیں جاتا۔" یہ ہے مطلب نگاری کی استعداد "مفکر اور علمی انسانوں" کی ترکیب بھی خوب ہے۔ اور پھر اسی کی وجہ سے مصلح اعظم سر سید مرحوم اور جسٹس محمود بھی اپنے اس "نادان دوست" کی زد میں آجاتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں "سر راس مسعود مرحوم، انگریزی عہدہ داروں سے کبھی جھک کر نہ ملتے تھے۔ وہ جس طرح شکل و صورت کے اعتبار سے وجیہ تھے، اُسی طرح قلب و خمیر کے لحاظ سے خوددار اور حوصلہ مند تھے۔ اُن کے دل و دماغ مغرب زدگی کے طوفان سے متاثر نہیں ہوئے۔ راس مسعود مرحوم کی زندگی کا یہ پہلو ہندستانی عہدہ داروں اور ذی مقدرت اصحاب کے لیے اپنے اندر "عبرت" و بصیرت کا درس رکھتا ہے۔ ..."

پڑھنے والوں اور طلبائے جامعہ کو ادارۂ مجلۂ عثمانیہ نے لفظ "عبرت" جس طرح استعمال کیا ہے، اس سے البتہ عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

عابدی

تنقید و تبصرہ

مکاتیبِ غالب ناشر کتاب خانہ ریاست رام پور، مرتبہ امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتاب خانہ، قیمت (للعہ)۔

غالب کے متعلق بہت سی کتابیں شایع ہوئیں، لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا تعلق ریاست رام پور کے ساتھ کس قدر گہرا تھا۔ غدر سے چند سال پہلے سے لے کر تا دمِ زیست غالب دربارِ رام پور سے فیض یاب ہوتے رہے۔

فاضل مرتب نے ایک طویل دیباچہ بھی لکھا ہے جس سے غالب کی سوانح حیات اور خاص کر دربارِ رام پور کے ساتھ تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں (۱۱۷) خطوط ہیں جن میں سے (۴۲) نواب یوسف علی خاں اور (۶۵) نواب کلب علی خاں کے نام لکھے گئے ہیں۔ دو خطوط صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام ہیں، اور باقی خطوط ریاستِ رام پور کے عہدہ داروں، اور ایک مولوی محمد حسن خاں ایڈیٹر "دبدبۂ سکندری" کے نام ہے۔ کتابت نسخ ٹائپ میں ہے مطبع قیمہ بمبئی میں طبع ہوئی ہے۔ "مکاتیبِ غالب" ادبیاتِ غالب میں گراں قدر اضافہ ہے اور پرستارانِ غالب کے لیے اس سال کا بیش بہا تحفہ۔

تواریخ کانگریس مصنفہ ڈاکٹر بی پٹابھائی سیتا رامیا۔ ناشر نیشنل انڈسٹری بک ڈپو موہن لال روڈ لاہور۔ قیمت مجلد (عہ/)۔

یہ گیارہ سو (۱۱۰۰) صفحے کی ضخیم کتاب کانگریس کی مفصل تاریخ ہے اس کے چھ (۶) حصے کیے گئے ہیں اور ہر حصہ متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ اربابِ کانگریس کی چالیس سے زیادہ تصویریں

دی گئی ہیں۔ ممتاز کانگریسیوں کے حالات بھی دیے گئے ہیں۔ کتاب کو ظاہری حسن سے آراستہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

"میری کہانی" پڑھنے کے بعد اس کتاب کو پڑھنا بارِ خاطر ہے۔ اُس کے ترجمے میں اصلیت ہے اور وہ ادبیت سے معمور ہے۔ لیکن تواریخ کانگریس کے وہ قارئین جو انگریزی سے ناآشنا ہوں دس پانچ صفحے پڑھنے کے بعد کتاب چھوڑ دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں ایسے انگریزی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے لیے اُردو الفاظ بہ آسانی مل سکتے تھے۔ صفحہ (۱۶۰) سے صفحہ (۱۸۰) تک صرف بیس صفحوں میں حسب ذیل انگریزی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں :-

میٹنگ، آرگنائزر، ماڈریٹ، کانسٹی ٹیوشن، ایڈمنسٹریشن، سائینٹفک فرنیچر، پولیٹیکل گائیڈ، امپائر، انسٹی ٹیوشن، پوزیشن، سپرٹ، کنزرویٹیو، پبلک لائف، کیرکٹر، سوشیل رفارمر، ریگولیشن، انڈین ڈیپوٹیشن، آفیسر، ہسٹری، ڈیپوٹیشن، پروٹسٹ، سروسز، اکسایز ڈیوٹی، بیوروکریسی، ڈرافٹ۔

اسی کتاب میں انھیں الفاظ کے ترجمے دوسرے مقامات پہ استعمال کیے گئے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت بہت سہل انگاری سے کام لیا گیا ہے لیکن جب ہم ناشرین کا یہ اعلان پڑھتے ہیں کہ یہ کتاب صرف تین ہفتے کی شبانہ روز مسلسل محنتوں کا نتیجہ ہے، تو پھر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے گیارہ سو صفحے کی کتاب کی کتابت اور طباعت اور اس کا بازار میں آجانا اُردو طباعتی دنیا کا معجزہ ہے، اور پھر اس قدر ضخیم کتاب صرف (عہ) میں مفت ہی ہے۔ کتابت اور طباعت معمولی سی ہے، لیکن جب عُجلت پر نظر کی جائے تو یہی بہت غنیمت ہے۔ فہرست مضامین یا ابواب کی عدم موجودگی اس کتاب کے لیے تکلیف دہ ہے۔

آصفی کہانیاں

مولفۂ عبدالسلام صاحب ذکی بی، اے، بی، ٹی (عثمانیہ) قیمت سرکارِ عالی سے (عہ) اور عوام سے (۸ر)۔

یہ خانوادۂ آصفی کے حالات کا مجموعہ ہے، جو بچوں کے لیے کہانیوں کی شکل میں

لکھا گیا ہے۔ اس میں گیارہ کہانیاں ہیں، پہلی کہانی میں حضرت آصف جاہ اول کے جد امجد کے حالات ہیں، اس کے بعد ہر کہانی میں ہر ایک بادشاہ کا حال سلیس پیرایے میں بیان کیا گیا ہے، اس طرح گیارھویں کہانی میں حضرت آصف جاہ سادس کے حالات ہیں۔ کتاب کو پرنس والا شان کرنل نواب مکرم جاہ بہادر اطال العمرہٗ کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کی گئی ہے۔ ایسی چیزوں کی اُردو ادب میں سخت ضرورت ہے۔ بچوں کے لیے کتابیں لکھنا، اور بالخصوص ایسی کتابیں جو تاریخی واقعات کی حامل ہوں مشکل چیز ہے۔ بچوں کو ابتدا ہی میں اگر اپنے ملک کے واقعات معلوم ہو جائیں تو نہ صرف تاریخ سے اُنس پیدا ہوگا، بلکہ وہ اپنے ملک کی تاریخ سے واقف ہو کر ملک سے محبت کرنا سیکھ لیں گے۔ کتاب میں پیش لفظ "مولوی عبد المجید صاحب صدیقی نے لکھا ہے، اور مقدمہ مولوی عبد القادر صاحب سروری نے۔ صدیقی صاحب بجا فرماتے ہیں "یوں تو تاریخ ہر وقت، ہر زمانے میں پیشِ نظر رہنی چاہیئے، لیکن اس کا صحیح ذوق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اس کو ابتدائی تعلیم کا جز بنا دیا جائے" تاریخ ابتدائی تعلیم کا جز اب بھی ہے، لیکن اس کے لیے (ایسی) کتابیں نہیں جن کو بچوں کے قابل کہا جا سکے۔ زبان کو اور زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی جاتی تو اچھا تھا۔ اس میں محاورے زیادہ استعمال کیے گئے ہیں اور بعض مشکل الفاظ کے معنے بھی نہیں دیے گئے۔ کتابت میں "غازی" ایک طرف اور "الدین" دوسری طرف۔ "زین" ایک طرف "دار" دوسری طرف لکھا گیا ہے۔ اس طرح لکھنے سے الفاظ مہمل ہو جاتے ہیں، اس کا خیال نہ صرف مصنفین و مولفین، بلکہ ہر کاتب کو رکھنا چاہیئے۔ بہ حیثیتِ مجموعی مولف کی یہ کوشش قابلِ ستایش ہے۔ امید ہے کہ نونہالانِ ملک اس سے اچھی طرح استفادہ کریں گے۔

نارجیلستان ماہوار۔ تلچری، مالا بار۔ زیر ادارت مولوی سید ہارون "ندوی" قیمت سالانہ ڈھائی روپیے۔

مدیر اعزازی	مالک	نگران وصول
اعجاز صدیقی اکبرآبادی	عبد الکریم سیٹھ اختر تلچری	مولانا محوی لکھنوی

نارجیلستان کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔ فاضل مدیر کا کہنا ہے کہ اس میں مذہبی، تاریخی، ادبی اور

اصلاحی مضامین شایع ہوں گے۔ پہلے نمبر میں جملہ بیس مضامین ہیں جن میں نظموں کی تعداد گیارہ ہے۔ مذہبی مضامین کی تعداد زیادہ ہے نظموں کا معیار بلند ہے اور نثر کے مضامین بھی بُرے نہیں۔ لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ اعجاز صدیقی اکبرآبادی اور مولانا محوی صدیقی کے مشوروں کے بعد رسالہ ترقی کے منازل طے کرے گا۔ مالابار سے نارجیلستان کا اجرا اس امر کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ اُردو قراقرم کی چوٹیوں سے راس کماری تک کی عام زبان ہے۔

قابل مدیر "معروضات" میں لکھتے ہیں "یہاں کی فضا بندیان اُردو کی فضا ہے، اُردو سیکھنے کا نیا نیا ذوق و شوق ہے اس اعتبار سے یہاں کی ادبی دنیا میں ابتدائی مدارج کی چیز پیش کرنے کی ضرورت ہے"۔

اس بیان کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ رسالے میں نظم کا حصہ حد سے زیادہ ہو گیا ہے، مبتدیوں کو نظم بہ نسبت نثر کے مشکل معلوم ہوتی ہے نثر کا حصہ زیادہ رہے تو بہتر ہے۔ ہم اپنے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

فہرس کتب خانہ سٹی کالج۔ مرتبہ مولوی غلام رسول صاحب مددگار سٹی کالج حیدرآباد۔ قیمت (عما)

مولوی غلام رسول صاحب سے ادبی دنیا ناواقف نہیں ہے۔ آپ کو ہندی اور اُردو ادبیات سے خاص لگاؤ ہے۔ کتابیات سے بھی خاص دلچسپی ہے اسی لیے مولوی سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج نے اپنے مدرسے کے کتب خانے کی فہرس کا کام آپ کے سپرد کیا۔ کتب خانہ سٹی کالج میں، فوقانی طلبا کے لیے اُردو کتابوں کا اتنا ذخیرہ ہے کہ حیدرآباد کے کسی دوسرے فوقانیہ مدرسے میں نہیں۔ مولوی غلام رسول صاحب نے اس کتب خانے کی ایک فہرس کولن تقسیم کے طریقے پر مرتب کی ہے۔ طریقۂ کولن تقسیم مدراس میں تقریباً پندرہ سال سے رائج ہے، اُردو زبان میں اب تک کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی اور نہ علم کتاب داری ہی کو کوئی مستقل علم سمجھا گیا۔ حالانکہ ترقی یافتہ زبانوں میں یہ علم ایک مستقل صورت اختیار کر چکا ہے۔ اور کتاب داری کے مختلف طریقے مثلاً ڈیوی ڈسمل اور کانگریس وغیرہ رائج ہو چکے ہیں۔ اُردو زبان میں فہرس کتب کی جدید طریقے سے ترتیب کا سہرا حیدرآباد دکن کے سر رہا۔

محمد اکبرالدین صدیقی

ششماہی رپورٹ

انجمن طیلسانین عثمانیہ

۲۶ر آبان ۱۳۴۲ف کو انجمن کے جلسۂ عام میں سال ۱۳۴۳ف کے لیے انجمن کی کابینہ کی تشکیل حسب ذیل قرار پائی۔

کلیم الدین صاحب انصاری بی اے ال ال بی وکیل ہائیکورٹ صدر

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ام اے پی ایچ ڈی نائب صدر

۳۔ محمد غوث ام اے ال ال بی معتمد

۴۔ شنکرجی صاحب بی اے نائب معتمد

۵۔ گنڈے راؤ صاحب ہرد الکر بی اے ال ال بی خازن

۶۔ میر احمد علی خاں صاحب ام اے ال ال بی رکن

۷۔ میر اکبر علی خاں صاحب بی اے بیرسٹر رکن

۸۔ سید محمد صاحب ام اے رکن

۹۔ عبد المجید صاحب صدیقی ام اے رکن

۱۰۔ رگھویر علی صاحب بی اے رکن

۱۱۔ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی رکن

۱۲۔ محمد داور حسین صاحب بی اے ال ال بی رکن

اس ششماہی میں کابینہ کی اس تشکیل میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ البتہ گنڈے راؤ صاحب خازن انجمن کو بہ اغراض سرکاری طویل مدت کے لیے بلدہ سے باہر رہنا پڑتا ہے، اس لیے کابینہ نے قرار دیا کہ خازن کے فرائض بھی معتمد ہی انجام دے۔

واضح ہو کہ انجمن کے کاروبار کو دو نوعیتوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو خود انجمن کے اندرونی امور، دوسرے وہ امور جن کے متعلق انجمن سرکار عالی اور دوسرے سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی توجہ مبذول کراتی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہر نوعیت کار کے متعلق

علحدہ وضاحت کی جائے۔ پہلے خود انجمن کے اندرونی کاروبار کے متعلق صراحت کی جاتی ہے۔

انجمن کے اندرونی کاروبار انجمن کے کاروبار کی وسعت کے لحاظ سے کام کئی ذیلی اور ملحقہ کمیٹیوں میں تقسیم ہے۔ بعض کمیٹیاں مستقل ہیں اور بعض عارضی اور وقتیہ۔ مستقل کمیٹیوں میں عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی گو انجمن کی ملحقہ کمیٹیاں ہیں، لیکن اپنے کاروبار میں بڑی حد تک آزاد ہیں۔ ان کے مستقل قواعد انجمن نے منظور کیے ہیں۔

عثمانیہ بلدی جماعت عثمانیہ بلدی جماعت کچھ عرصے سے مصروفِ عمل ہے، اس کی روئداد کار کے متعلق اس موقع پر کسی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ اشارہ کافی ہے کہ فی الوقت (۱۳) منتخب ارکان مجلس بلدیہ کے منجملہ (۷) ارکان عثمانیہ بلدی جماعت کے رکن ہیں اور جماعت آہستہ آہستہ اپنا وقار قایم کرتی جارہی ہے۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ قواعد عثمانیہ بلدی جماعت کے دفعہ (۱۰) ضمن ب کی رو سے جماعت کی مجلسِ عاملہ میں کابینہ انجمن کو پانچ ارکان کے مقرر کرنے کا حق حاصل ہے، حسبہٗ کابینہ نے سالِ حال کے لیے حسب ذیل اصحاب کو رکن مقرر کیا:۔

۱۔ میرزا اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر ۲۔ میر احمد علی خاں صاحب ام اے ال ال بی
۳۔ محمد غوث ام اے ال ال بی ۴۔ شنکرجی صاحب بی اے
۵۔ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی وکیل ہائیکورٹ

انجمن کے جلسۂ عام منعقدہ ۲۰ ردے ۱۳۴۷ف میں عثمانیہ بلدی جماعت کے قواعد میں متعدد ترمیمات منظور ہوئیں۔ ایک اہم ترمیم یہ منظور ہوئی کہ آیندہ سے جماعت کی رکنیت کے لیے کابینۂ انجمن کی منظوری ضروری نہیں ہے۔ قرار دیا گیا ہے کہ جماعت کی رکنیت کے لیے جملہ ارکان مجلسِ بلدیہ، جملہ میر محلہ گانِ اعزازی اور جملہ طیلسانئین عثمانیہ مقیم حدود بلدیہ، جماعت کی مجلسِ عاملہ کی منظوری کے بغیر جماعت کے رکن ہو سکیں گے، لیکن دوسرے اصحاب کی شرکت کے متعلق یہ امر لازم قرار دیا گیا ہے کہ ان کے نام مجلسِ عاملۂ جماعت میں

پیش ہو کر منظور کیے جائیں۔

معاشی کمیٹی سال حال عثمانیہ بلدی جماعت کی طرح انجمن کے جلسۂ عام منعقدہ ۲۷ ردے ۴۷ف نے معاشی کمیٹی حیدرآباد کے قواعد منظور کیے۔

ان قواعد کا خلاصہ یہ ہے :۔

۱۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی ایک مستقل ذیلی کمیٹی، بنام معاشی کمیٹی قایم رہے گی اس کا نام "معاشی کمیٹی حیدرآباد" ہوگا۔

۲۔ معاشی کمیٹی کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے :۔

الف، ملک کی معاشی ترقی کے لیے جد و جہد کرنا۔

ب، تعلیم یافتہ افرادِ ملک اور بالخصوص فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی معاشی زندگی کی جد و جہد میں ان کا ہاتھ بٹانا۔

۳۔ معاشی کمیٹی میں ہر وہ شخص شریک ہو سکے گا جو کمیٹی کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھتا ہو اور جس کی رکنیت کو کمیٹی کی مجلسِ عاملہ منظور کرے۔

۴۔ کمیٹی کی رکنیت کا سالانہ چندہ (عہ) سکۂ عثمانیہ ہوگا لیکن ارکان انجمنِ طیلسانئین عثمانیہ بلا ادائی چندہ، رکن متصوّر ہوں گے۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ اپنے ارکان کے سالانہ چندۂ موصولہ کا آٹھواں حصہ ہر سال کمیٹی کو دیا کرے گی۔

۵۔ معاشی کمیٹی کی مجلسِ عاملہ حسب ذیل ہوگی :۔

۱۔ صدر۔ ۲۔ معتمد۔ ۳۔ نائب معتمد۔

چار ارکان جنھیں کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ نامزد کرے گی۔ چار ارکان جن کا انتخاب کمیٹی کا جلسۂ عام ہر سال بہ ماہ آبان بہ ذریعہ خفیہ رائے دہی کرے گا۔

۶۔ صدر معتمد اور نائب معتمد کا انتخاب بھی خفیہ رائے دہی کے ذریعے سالانہ جلسۂ عام میں بہ ماہ آبان ہوگا۔

کمیٹی کے جلسۂ عام منعقدہ ۳۰ ر اردی بہشت میں مجلسِ عاملہ کی تشکیل حسب ذیل قرار پائی :۔ صدر، میر محمود علی صاحب ام اے۔ معتمد، محمد عبدالرحیم صاحب بی اے۔

نائب معتمد محمد علی خاں صاحب بی، اے۔ ارکان کے لیے راجہ رائے گرو داس صاحب، مرزا عبدالباسط بیگ صاحب، خواجہ حمید احمد صاحب اور غلام دستگیر صاحب رشید کا انتخاب عمل میں آیا۔ کابینہ نے اپنی جانب سے حسب ذیل اصحاب کو مجلسِ عاملہ کا رکن مقرر کیا ہے:-

۱۔ سید محمد احسن صاحب بی، اے، ال، ال، بی وکیل ہائیکورٹ، رکن مجلس بلدیہ۔

۲۔ شنکر جی صاحب بی، اے۔

۳۔ منوہر سنگھ صاحب ام، اے، ال، ال، بی وکیل ہائیکورٹ۔

۴۔ محمد غوث ام، اے، ال، ال، بی۔

یہ کمیٹی ابتدائی اُمور کو طے کرنے میں مصروف ہے۔

مجلسِ علمیہ عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی کے سوا انجمن کی ایک مستقل ذیلی کمیٹی مجلسِ علمیہ ہے، گو اس کے لیے ابھی مستقل قواعد کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، لیکن مجلس اپنے کام میں پورے انہماک سے مصروف ہے۔ "مجلۂ طیلسانئین" اس مجلس کے اہتمام میں شایع ہوتا ہے۔ اس مجلہ کے استحکام اور ترقی کے لیے کابینہ نے مد متفرق سے (۵۰) روپیے منظور کیے۔ مزید پچاس روپیے کے لیے جلسۂ عام کی منظوری لی جائے گی۔ مجلہ کی ترقی کے وسایل سوچنے اور اس کی مالی حالت کو مستحکم کرنے کے لیے کابینہ نے قرار دیا ہے کہ کلیم الدین صاحب انصاری، شنکر جی صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی اور میر احمد علی خاں صاحب مجلسِ علمیہ سے مشاورت فرمائیں اور کوشش وسعی کا حق ادا کریں۔

میر احمد علی خاں صاحب نے مجلہ کے لیے (۲۵) روپیے کے ایک علٰحدہ عطیہ کا وعدہ فرمایا ہے۔

مجلۂ طیلسانئین مجلہ کے متعلق ارکانِ انجمن کو خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے اس کی سالانہ رپورٹ جو کابینہ میں پیش ہوئی یہاں نقل کی جاتی ہے:-

آذر ۱۳۴۵ف میں "مجلۂ طیلسانئین" کی اجرائی عمل میں آئی اور آبان ۱۳۴۶ف تک چار نمبر شایع ہوئے جس میں مختلف مضامین نظم و نثر کے علاوہ حسب ذیل مقالے بھی شایع ہوئے:-

۱۔ اُردو ادب بیسویں صدی میں۔

۲۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست۔

۳۔ احمد شاہ ولی بہمنی۔

ان میں اوّل الذکر دو مقالے علٰحدہ کتابی صورت میں ڈھائی ڈھائی سو کی تعداد میں طبع کیے جا چکے ہیں اور آخر الذکر زیر طبع ہے۔ رسالۂ طیلسانئین میں دیگر حضرات کے علمی و ادبی مضامین اور نظموں اور تنقیدوں کے علاوہ انجمن کی رودادیں بھی شایع ہوتی رہتی ہیں۔

تعداد خریداران اس وقت تک خریداروں کی تعداد جس میں معطی بھی شامل ہیں صرف (۱۴۰) ہے۔

عطیہ و چندہ جملہ آمدنی (للعہ ۹/) ہے جس میں (سماللعہ) حسب ذیل حضرات کے عطیوں کے بھی شامل ہیں:

انجمن طیلسانئین عثمانیہ	(ماد)	۷۔ مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی	صعہ
۲۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بر سٹر	(صہ)	۸۔ مولوی سید محمد صاحب ام اے	(صعہ)
۳۔ پروفیسر محمد علی خاں صاحب نظام کالج	(صعہ)	۹۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر	(صہ)
۴۔ نواب میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے	(صعہ)	۱۰۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی	(صعہ)
۵۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	(صعہ)	۱۱۔ مولوی شاہ عالم خاں صاحب	(عہ)
۶۔ ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب	(صعہ)	۱۲۔ احمد اللہ صاحب انسپکٹر آبکاری	(صہ)

اخراجات رسالے کے تمام حسابات آمدنی و خرچ بہ صحت تمام مندرج و محفوظ ہیں:۔

جملہ آمدنی للعہ ۹/

جملہ خرچ للعہ ۳/

سلک صعہ ۶/

اس وقت سلک میں (صعہ ۶/) ہیں جس میں (لے) سال آیندہ کے چندے کے بھی شریک ہیں۔

مختلف رسائل کو تبادلہ اور ریویو کے لیے ملک کی مختلف پبلک انجمنوں استفادۂ عام کے لیے مجلس علمیہ تیں پرچے مفت تقسیم کر رہی ہے۔

کابینہ نے مجلس علمیہ میں بی، این چوبے صاحب کی بجائے جنھوں نے مجلس کی رکنیت سے استعفا دے دیا رائے مہندر راج صاحب سکسینہ ام، ایس، سی کو رکن مقرر کیا ہے۔

عارضی کمیٹیاں فی الوقت جو عارضی کمیٹیاں قایم ہیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کمیٹی ترمیم دستور۔

۲۔ کمیٹی برائے قیام انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ۔

۳۔ کمیٹی برائے انعقاد جلسۂ عام در بارہ احتجاج تحدید کلیات۔

۴۔ کمیٹی برائے قیام والنٹیر کور۔

۵۔ کمیٹی برائے تکمیل پروگرام انجمن برائے سالِ حال۔

۶۔ کمیٹی اس غرض سے کہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس سے طیلسانیین میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ

انجمن کی سالانہ سرگرمیوں میں کانفرنس طیلسانیین عثمانیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سالِ حال کی کانفرنس کے لیے مرزا عبدالباسط بیگ صاحب بی' اے معتمد مقرر کیے گئے تھے انھوں نے فرض شناسی اور محنت و سرگرمی اور کفایت سے کانفرنس کو کامیاب بنانے کی پوری سعی کی۔ کانفرنس صدرِ انجمن کی صدارت میں بہ تواریخ ۱۵ و ۱۶ آذر ۱۳۴۷ف بہ مقام سٹی کالج منعقد ہوئی۔ سالِ حال ڈرامے اور مشاعرے کا انتظام نہ ہو سکا۔ البتہ نمائشِ کتب اور ڈنر کا انتظام عمل میں آیا۔ نیز ریڈیو اسٹیشن پر کانفرنس کے سلسلے میں ایک خاص پروگرام نشر کیا گیا جس میں طیلسانی خواتین نے بھی حصہ لیا۔ کانفرنس پر جملہ اخراجات بہ شمول ڈنر (مامہ ۱۴؍۶؍۱۴) عائد ہوئے (للعلہ) ارکان مجلس استقبالیہ سے وصول ہوئے۔ باقی رقم انجمن کے عام فنڈ سے یا تو ادا ہو چکی ہے یا ادا ہو رہی ہے۔ کانفرنس کے متعلق ایک تفصیلی نوٹ مجلۂ ہٰذا کی گزشتہ اشاعت میں طبع ہو چکا ہے۔

انجمن کے لیے سال حال کا پروگرام

سال حال کے لیے انجمن کا جو لائحہ عمل ہونا چاہیئے اس کے متعلق کابینہ نے قرار دیا ہے کہ بہ دوران سال اُمورِ ذیل کی تکمیل کی کوشش کی جائے۔

۱۔ عثمانیین کی مختلف علمی و ادبی کوششوں کو ایک مرکز پر لانے کی سعی۔

۲۔ "مجلۂ طیلسانیین" کو ترقی دینا اور اس کی اصلاح۔

۳۔ نصاب تعلیم نسواں کی ترتیب۔

۴۔ ایک سرمایۂ محفوظ کی فراہمی، تاکہ ایک پریس قایم کیا جا سکے اور اخبار کی اجرائی

ممکن ہو جائے اور طیلسانیین عثمانیہ کے مختلف علمی کارنامے منظرِ عام پر آسکیں۔

اس سلسلے میں کابینہ نے قرار دیا کہ فراہمیٔ سرمایہ کے لیے پہلے اضلاع میں کام شروع کیا جائے اور اس ضمن میں کام کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے قرار دیا گیا کہ صدر صاحب انجمن حسب صوابدید خود کارروائی عمل میں لائیں۔ صدر صاحب انجمن نے سرمایۂ محفوظ کے فراہم کرنے کی کوشش کے لیے حسب ذیل ارکان کی کمیٹی مقرر کی:۔

۱۔ عبدالرؤف صاحب بی اے ال ال بی۔ ۲۔ سید محمود احمد صاحب بی اے ال ال بی

۳۔ شنکرجی صاحب بی اے۔ ۴۔ سید یامین صاحب زبیری بی اے ال ال بی

۵۔ بنکٹ پرشاد صاحب بی اے ال ال بی۔ ۶۔ معتمد انجمن۔

۷۔ صدر انجمن۔

اس سلسلے میں معتمد و نائب معتمد نے بیڑ اور پربھنی کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر سے کئی ایک فوائد حاصل ہوئے۔ انجمن سے ایک بڑی جماعت واقف ہوگئی، انجمن کا ادب کئی ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ تبادلۂ خیالات اور باہمی ارتباط کا موقع ہاتھ آیا، اور اس امر کا احساس ہوا کہ ساری عثمانیہ برادری میں کام کرنے کی تڑپ اور ان میں ملک کی خدمت کا پورا ولولہ موجود ہے۔ بہرحال کام کرنے کے لیے بہت اچھے مواقع حاصل ہیں ضرورت یہ ہے کہ خود ہم مستعدی اور استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

اغراض و مقاصد انجمن میں وسعت

یہ امر محسوس کیا گیا کہ مملکتِ آصفیہ کی ترقی کے اس عبوری دور میں ایک سے زیادہ مسائل ایسے پیش ہوں گے جن کے متعلق انجمن کو غور کرنے اور اپنی رائے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، لیکن دستور انجمن میں جو اغراض و مقاصد مقرر کیے گئے تھے، وہ کافی طور پر وسیع نہیں تھے۔ اس لیے جلسۂ عام منعقدہ ۷ ار بہمن ۴۶ ف میں قرار پایا کہ اغراض و مقاصدِ انجمن بہ موجب دفعہ ۲ ضمن ۱ الف دستور انجمن "ملک کی علمی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی ترقی کی جد و جہد کرنا اور طیلسانیین عثمانیہ میں خدمتِ ملک کا احساس پیدا کرنا" کی بجائے حسب ذیل ہوں گے:۔

"ملک کی علمی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور دیگر ہر جہتی ترقی کی جد و جہد کرنا اور

مفادِ ملک کے تمام مسائل میں حصہ لینا اور نیز طیلسانیئن عثمانیہ میں خدمتِ ملک کا احساس پیدا کرنا۔"

اس وسعتِ مقاصد سے انجمن اور کابینہ کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

تعدادِ ارکان زیرِ تبصرہ ششماہی میں (۱۲) جدید ارکان کی شرکت عمل میں آئی۔ اب انجمن کے ارکان کی تعداد (۴۸۳) ہے۔ بلدہ کے (۳۳۶) اور اضلاع کے (۱۴۷)۔ ضرورت ہے کہ توسیعِ ارکان کے متعلق خود ارکانِ انجمن خاص کوشش عمل میں لائیں۔

انجمن کی شاخیں ورنگل، گلبرگہ، بیڑ، محبوب نگر میں انجمن کی شاخیں قایم ہیں، لیکن تفصیلات سے مطلع نہیں کیا گیا ہے۔ توقع تھی کہ رائچور اور پربھنی میں جلد ایک ایک شاخ قایم ہو جائے گی، لیکن تا حال ان کا قیام عمل میں نہیں آیا۔

انجمن کی توجہ دہانیاں اب ان امور کے سلسلے میں کیفیت پیش کی جاتی ہے جن کے متعلق انجمن توجہ دہانی کا فرض انجام دیتی ہے۔

تحریکاتِ کانفرنس سب سے اول تحریکاتِ کانفرنس کے متعلق کیفیت پیش ہے۔ کانفرنس میں اعلحضرت بندگانِ عالی متعالی سے اظہارِ عقیدت کی جو تحریک منظور ہوئی وہ بذریعہ تار بارگاہِ خسروی میں گزرانی گئی تھی۔ جناب چیف سکرٹری صاحب پیشی خداوندی نے جو جواب مرحمت فرمایا وہ بہ کمال بہجت و افتخار ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

His Exalted Highness, appreciates the loyal sentiments expressed therein

پہلی سالانہ کانفرنس میں یہ قرار داد منظور ہوئی تھی کہ جامعہ عثمانیہ سے متعلقہ مجالس میں ایسے طیلسانیئن عثمانیہ کو بھی شریک کیا جائے جن کو جامعہ سے کوئی تعلقِ ملازمت نہ ہو۔ یہ تحریک یوں تو عرصے سے اربابِ جامعہ کے زیرِ غور ہے اور توجہ دہانی کا سلسلہ جاری ہے لیکن سالِ حال کے اجلاس مجلسِ رفقاء میں میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر کی تحریک کی بنا پر مختلف مجالسِ نصاب میں ایسے عثمانیئن کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو جامعہ کے دائرۂ ملازمت میں شامل نہیں ہیں، یا جن کا تعلق انٹرمیڈیٹ کالجوں سے ہے، یا جن کو

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تفصیل یہ ہے :-

۱۔ مجلسِ نصاب انگریزی ۔ فضل حق صاحب بی اے (عثمانیہ) بی اے آنرز (کنٹب)، پروفیسر نظام کالج۔
۲۔ مجلسِ نصاب فارسی ۔ غلام دستگیر صاحب رشید ام اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج۔
۳۔ مجلسِ نصاب تاریخ ۔ میر محمود علی صاحب ام اے لکچرار سٹی کالج۔
۴۔ مجلسِ نصاب معاشیات و عمرانیات ۔ عبداللطیف صاحب رضوی بی اے (عثمانیہ) بی ایس سی (لندن)۔
۵۔ مجلس نصاب ریاضی فنون ۔ وینکٹیش نرسہوان راؤ صاحب پٹواری ام اے لکچرار سٹی کالج۔
۶۔ مجلس دینیات لازمی ۔ محمد غوث ام اے ال ال بی
۷۔ مجلس ریاضی شعبۂ سائنس ۔ وینکٹیش نرسہوان راؤ صاحب پٹواری ام اے

مجالسِ نصاب اردو کیمیا اور طبعیات اور مجلس شعبۂ قانون کے لیے جو اسما پیش کیے گئے تھے، وہ غالباً کسی امر ضابطہ کی بنا پر منتخب نہ ہو سکے، البتہ کلیم الدین صاحب انصاری بی اے ال ال بی کا انتخاب بہ حیثیتِ جز وقتی لکچرار شعبۂ قانون میں رکنیت پر عمل میں آیا ہے۔

امتناع مسکرات کے لیے قانون وضع کرنے کے متعلق جو تحریک منظور ہوئی ہے اس کے سلسلے میں کارروائی عمل میں لانے پر محمد عبداللہ پاشا صاحب بی اے ال ال بی رکن مجلس وضع قوانین نے مطلع کیا ہے کہ وہ اس غرض کے لیے قانون کا مسودہ مرتب فرما رہے ہیں۔

امتحان میٹرک کے نصاب میں تاریخ انگلستان کی طرح تاریخ اسلام کو بھی شامل کرنے کے لیے کانفرنس ۱۳۴۶ف نے تحریک منظور کی تھی۔ مسجل صاحب جامعہ عثمانیہ نے اب مطلع کیا ہے کہ مجلس رفقا نے تاریخ اسلام کو نصابِ میٹرک میں بہ طور مضمون اختیاری شریک کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

قرض دہندگان کو اپنا کاروبار بعد حصول اجازت سرکاری انجام دینے کے لیے کانفرنس ۱۳۴۵ف نے تحریک منظور کی تھی، اس کے متعلق محکمۂ معتمدی مالگذاری سے اطلاع ملی ہے کہ مسودۂ قانون قرض دہندگان مرتب ہو چکا اور حکومت کے زیر غور ہے، اور یہ کہ مسودۂ مذکور کانفرنس کی تحریک پر حاوی ہے، اس سلسلے میں ابھی دو ایک دن بیشتر

سررشتۂ معلوماتِ عامہ نے جو کمیونکے شایع کیا ہے اس سے سرکارِ عالی کے سارے تجاویز اب عام ہو چکے ہیں۔

۱۳۴۶ف کی کانفرنس میں یہ قرارداد منظور ہوئی تھی کہ ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کے امتحاناتِ ڈرائنگ کا تعلق بمبئی سے منقطع کر دیا جائے اور خود سرکارِ عالی اپنے امتحانات کا انتظام فرمائے۔ اس بارے میں نظامتِ تعلیمات کی اطلاع ہے کہ کارروائی جاری ہے اور جلد اس کے انتظام کی توقع ہے۔

شعبۂ قانون میں ال، ال، بی سے مافوق قانونی تعلیم کے انتظام کے سلسلے میں ۱۳۴۵ف میں کانفرنس نے ایک تحریک منظور کی تھی۔ اس کے سلسلے میں معتمد صاحب جامعہ عثمانیہ نے مطلع کیا ہے کہ کارروائی جاری ہے۔ اس طرح مابعد ام، اے ریسرچ پر جامعہ عثمانیہ میں ڈگری عطا کیے جانے کے متعلق جناب پرو وایس چانسلر صاحب کی اس تجویز سے مطلع کیا گیا ہے کہ "یہ امر پہلے ہی سے جامعہ کے زیرِ غور ہے اور اس کے متعلق کارروائی ہو رہی ہے۔"

جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کو حصولِ معاش میں اعانت کرنے کے لیے ایک مجلس فراہمیٔ روزگار کی کارروائی انجمن نے ۱۳۴۲ف سے جاری رکھی ہے، اب اس سلسلے میں معتمد صاحب نے مطلع کیا ہے کہ:۔

"جامعہ عثمانیہ میں تقررات کا ایک ادارہ قایم کرنے کے لیے جناب نایب معین امیر صاحب کی تجاویز پیش ہونے پر مجلسِ اعلیٰ سے تصفیہ ہوا ہے کہ سرکارِ عالی کی جانب سے پبلک سروس کمیشن کے مجوزہ قیام کے مدِ نظر سرِ دست اس ادارے کا قیام ملتوی رکھا جائے۔"

کانفرنس کی دوسری تحریکات کے متعلق بھی پوری توجہ سے اربابِ متعلق سے سلسلۂ مراسلت جاری ہے اور کچھ نہ کچھ توجہ ضرور مبذول ہو جاتی ہے۔

تحریکاتِ کابینہ

سالِ حال کابینہ نے جن متعدد امور پر اربابِ متعلقہ کی توجہ مبذول کرائی ہے اس کے سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ وضاحت ضروری ہے۔

دستوری اصلاحات

سب کو علم ہے کہ اس وقت ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی میں دستوری اصلاحات پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کام کر رہی ہے۔ ہماری برادری کے ایک ممتاز فرد

اور انجمن کے سابق صدر میر اکبر علی خاں صاحب بھی بہ حیثیت رکن شریک ہیں۔ سرکار عالی نے اعلان کیا تھا کہ ملک کے ادارے اگر چاہیں تو اس کمیٹی کے غور کے لیے اپنی اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ کابینہ نے بھی مجلس وضع قوانین کی توسیع کے سلسلے میں غور کیا۔ جو مراسلہ اور یادداشت معتمد صاحب کمیٹی کے پاس روانہ کی گئی، وہ بہ طور ضمیمہ اس رپوٹ کے ساتھ منسلک ہے۔

جامعہ کے وظائف میں کمی جامعہ عثمانیہ میں طلباء کے وظائف میں جو کمی عمل میں لائی جارہی ہے اور معافیٔ فیس کا تناسب جو کم کیا جارہا ہے اس کے متعلق کابینہ نے جو قرارداد طے کی ہے، وہ اربابِ جامعہ کی خدمت میں بھیجی گئی ہے۔ اخبارات میں اس کی اشاعت عمل میں آچکی ہے، اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

تحریکات متعلق سررشتۂ عدالت کابینہ نے سررشتۂ عدالت اور تعلیم قانون کے متعلق بھی کئی امور میں سرکار عالی اور جامعہ کو متوجہ کیا ہے مثلاً ۱۔ ال ال بی میں اوّل آنے والے طالبِ علم کے لیے منصفی کی ایک جائداد محفوظ کی جائے ۲۔ ال ال بی کلاس میں وظائف اور معافیٔ فیس کی ضرورت ہے۔ ۳۔ سررشتۂ عدالت میں سیولینس کا داخلہ روک دینا چاہیئے۔ ۴۔ امتحان وکالت درجۂ سوم و دوم کی مسدودی عمل میں لائی جائے۔ ۵۔ جونیر وکلاء کی بہترین تربیت کا انتظام عمل میں لایا جائے۔ ۶۔ سررشتۂ عدالت میں ماتحت جائدادوں پر ال ال بی کامیاب اصحاب کو زیادہ بہ زیادہ ماموُر کیا جائے۔

ان امور پر توجہ دلانے کے لیے کابینہ کے ایک وفد نے جناب میر مجلس صاحب عدالت سے ملاقات بھی کی۔ وفد کو توقع ہے کہ ضرور ان معاملات میں مجلسِ عالیہ عدالت کی توجہ مناسب طور سے مبذول ہوگی

سالِ حال سول سروس، تحصیلداری اور کیڈٹوں کے انتخابات کے سلسلے میں عثمانئین کو جو محرومی نصیب ہوئی، اس کے بارے میں بھی کابینہ اصحابِ مقتدر سے مراسلت کر رہی ہے۔ چنانچہ نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں ایک یادداشت روانہ کی گئی۔ اس کا مناسب جواب وصول ہوا ہے اور ابھی سلسلۂ مراسلت جاری ہے۔

خاتمہ انجمن کے کاروبار کے چھ ماہ کی یہ ایک مختصر روداد ہے، اس چھ ماہ کے عرصے میں دفتری طور سے جو کام انجام پایا اور جو مراسلت ہوئی اور کابینہ نے کئی کئی گھنٹے جو کام کیا اس کی ساری تفصیلات بہت طویل ہو جائیں گی۔ مختصر یہ کہ کام کرنے اور اس سے اچھے سے اچھے نتائج حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ہمیں حاصل ہے! کامیابی کی بڑی بڑی وسعتیں اپنا دامن پھیلائے پڑی ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہماری طیلسانی برادری اپنی توجہ بڑھائے اور درم و قدم کی اعانت میں ذرا تیزروی بتائے۔

حسابات

آمدنی ۱۳۴۷ف کا آغاز (مالعہ) کی سلک سے ہوا۔ اس ششماہی میں موازنہ کے مدات منظورہ کے تحت جو آمدنی ہوئی اس کا حال یہ ہے:۔

۱۔ چندۂ ارکان۔ رقم مجوزہ سال تمام (صما) ہے۔ ۱۳؍ اردی بہشت ۱۳۴۷ف تک (ما مدعہ) وصول ہوئے۔ اس رقم کے منجملہ چندۂ ششماہیِ اوّل کی بابتہ (ما مدعہ) وصول ہوئے۔ باقی رقم (ما) سال ہائے گزشتہ کے بقایا کی بابت ہے۔

چندۂ رکنیت کی ادائی کی طرف ارکان صاحبان انجمن زیادہ توجہ مبذول فرمائیں تو مناسب ہوگا۔

مجلہ کی قیمت اور انجمن کے چندے کی وصولی کے لیے جو ریلوے اپیل پارسل کیے گئے، ان کو بعض بلند ہمت طیلسانی برادروں نے لعہ۔لعہ روپیے بھی ادا کر کے حاصل کیے۔ خدا کرے کہ ایسے مخلص برادروں کی مثالیں دن بہ دن زیادہ ہوتی جائیں۔

۲۔ مدکانفرنس کے تحت (صہ) کا اندازہ تھا۔ (ہیہ) کی آمدنی ہوئی، (ہیہ) تو مرزا عبدالباسط بیگ صاحب نے واپس فرمائے، اور (صہ) ۱۳۴۶ف کی کانفرنس کے متعلق شنکرجی صاحب نے ڈاکٹر سید حسین صاحب کے عطیئے کی باقی سلک کے سلسلے میں جمع کرائے۔

۳۔ عطیات کا اندازہ سال تمام میں (سما سہ) کیا گیا ہے۔ اس ششماہی کے دوران میں

(ماللعہ) وصول ہوئے (سے ۵ر۴ر۴ر)۔ میرزا ہدعلی صاحب کاتل کا ایک مشت عطیہ ہے۔ ۵ر۴ر
میر احمد علی خاں صاحب نے (عـہ) اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے (عـہ)
اور سید سراج الدین احمد صاحب ام اے نے (عـہ) مرحمت فرمائے۔

۴۔ متفرق میں زائد از موازنہ (عـہ ۵ر) وصول ہوئے۔ (عـہ) اعظم خاں صاحب ام اے کو ۱۳۴۵ف تعمیر عمارت کی کمیٹی کے کام کے سلسلے میں اخراجات کے لیے دیے گئے تھے، اب انھوں نے بہ وجہ قیام اضلاع کام کرنا متعذر خیال کیا اور رقم بازگشت کر دی۔

۵۔ سرمایۂ محفوظ کے لیے بنک میں (صہ) نقد وصول ہوئے اس طرح جملہ آمدنی پورے ششماہی میں (ساللعہ) ہوئی۔

<u>اخراجات</u> ۱۔ عثمانیہ بلدی جماعت کو جو رقم ادا ہوگی اس کا اندازہ سال تمام میں (للعہ) ہے اس ششماہی میں (صہ) ادا کیے گئے۔

۲۔ تنخواہ ملازمین میں سال تمام (ساللعہ) کے منجملہ (ماسہ) ادا ہوئے۔ دو ملازمین، جز وقتی محرر کو (عـہ) اور کل وقتی ملازم کو (للعـہ) ادا ہوتے ہیں۔

۳۔ صادر میں رقم مجوزہ سال بھر کے لیے (للعہ) ہے۔ اس ششماہی کے دوران میں (عـہ ۸ر) صرف ہوئے۔

۴۔ ٹکٹ ٹپہ میں سال تمام کے لیے (عـہ) کا اندازہ کیا گیا تھا لیکن اسرار دی بہشت ۱۳۴۵ف تک (عـہ) صرف ہو گئے۔ اس طرح پہلے چھ ماہ میں ہی (عاں ۵ر) زائد از موازنہ خرچ ہوئے ہیں، اس زائد خرچ کی بڑی وجہ مراسلت کی زیادتی اور اس کے علاوہ ویلیو پے ایبل پارسلوں کی روانگی ہے، اس پر (عہ ۱۱ر۸ر۴ر) کا خرچ ہوا، لیکن اس کی وجہ سے اضلاع سے (عـہ) روپیے وصول ہوئے۔

۵۔ اخراجات کانفرنس کے لیے (ماں) روپیے مجوزہ ہیں اس کے منجملہ سال حال کی کانفرنس پر (ماسہ) خرچ ہوئے۔

۶۔ خریدی فرنیچر کے لیے (صہ) کی گنجایش رکھی گئی ہے اس ششماہی میں (عـہ) روپیے کا خرچ الماری کی خریدی پر عائد ہوا، سراج الدین احمد صاحب ام اے کا عطیہ (عـہ) روپیے

الماری کی خریدی کے لیے مخصوص تھا۔

۷۔ اخراجات متفرق کے لیے (مہ) کی رقم مجوزہ ہے تا حال (لہ ۳ر) کا خرچ عائد ہوا۔

کابینہ نے اس مد کے تحت طے کیا کہ "مجلہ طیلسانین" کو (صہ) کی رقم ادا کی جائے تا حال (مللعہ) ادا کیے جا چکے ہیں۔

۸۔ طباعت کے لیے (عـہ) رقم مجوزہ ہے اس ششماہی میں (عـہ) کا خرچ عائد ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (عـہ) بابت طباعت رپورٹ انجمن ۴۵ف مجلہ کو ادا کرنے کی کابینہ نے منظوری دی، یہ رقم بہت عرصے سے ادا شدنی تھی۔ توقع ہے کہ دوسری ششماہی میں زائد از موازنہ خرچ عائد ہوگا۔

۹۔ جلد سازی میں (عہ) رقم مجوزہ کے نسبت جملہ ۸ر صرف ہوئے۔

۱۰۔ درستیٔ سیکل کے مد میں (عہ) منظورہ کے منجملہ (صہ ۹ر) خرچ ہوئے۔

۱۱۔ دورۂ اضلاع کے لیے (صہ) منظورہ کے منجملہ (عـہ ۲ر۵ر) ادا ہوئے۔

۱۲۔ خریدیٔ کتب کے لیے عـہ
۱۳۔ الونس فراہمی چندہ کے لیے صـہ } شریکِ موازنہ ہے۔
۱۴۔ امداد کمیٹیاں کی غرض سے صہ

لیکن ان مدات میں اس ششماہی میں کوئی خرچ عائد نہیں ہوا۔

محمد غوث (معتمد)

ضمیمہ

۲۲ر اسفندار ۱۳۴۷ف کو معتمد صاحب دستوری کمیٹی کو جو مراسلہ لکھا گیا اور جو یادداشت روانہ کی گئی اُس کی نقل حسب ذیل ہے:۔

نقل مراسلہ

"سررشتۂ معلومات عامہ سرکار عالی نے ۲۲ردے ۱۳۴۷ف کو عام طور سے یہ اطلاع شایع کی کہ ملک کے مختلف اغراض اور حکومت کے مابین زیادہ موثر اشتراک عمل کے ایسے متبادل طریقوں کی تحقیق کرنے اور اُن کے متعلق سفارشات پیش کرنے جو ریاست کے حالات اور ضروریات کے مدنظر موزوں اور قابل عمل ہوں اور جن سے حکومت رعایا کی ضروریات اور جذبات سے ہمیشہ واقف رہ سکے جو کمیٹی حسب فرمان خسروی برسرعمل ہے اس کے افادہ کے لیے اظہار رائے کا ہر خواہش مند ادارہ اپنی تجاویز جناب کی خدمت میں ارسال کرے۔

کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ نے بھی مناسب خیال کیا کہ وہ بھی ان مسائل پر غور کرے۔ کابینۂ انجمن نے جو یادداشت مرتب کی ہے وہ حسب ہدایت کابینہ جناب کی خدمت میں مرسل ہے،' امید کہ براہ کرم اس کو کمیٹی کے ملاحظہ میں پیش فرمایا دیا جائے گا۔

انجمن کی جانب سے دستوری کمیٹی پر اس امر کو واضح کیا جانا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ انجمن ملک کی اعلےٰ تعلیم یافتہ جماعت ہونے کے لحاظ سے ہر اس تحریک کی حقیقی اعانت کے لیے تیار رہے جو صحیح اصول پر مملکت آصفیہ کی سیاسی ترقی کی باعث ہو سکے، لیکن سیاسی ترقی کے لیے بنیادی امر جو ملحوظ رہنا لازم ہے وہ یہ کہ ملک کے مختلف فرقوں اور طبقوں میں خیر سگالی اور حقیقی طور سے باہمی اعتماد قایم ہو۔ جہاں کہیں اعتماد موجود نہ ہو وہاں پہلی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ حقیقی طور پر یہ اعتماد پیدا ہو جائے۔ جو بھی اسکیم ملک کی

سیاسی ترقی کی خاطر مرتب کی جائے، اس کو اس بات کا ممد ہونا چاہیئے کہ اعتماد نہ صرف قایم رہے، بلکہ وہ اور قوی تر ہوتا جائے۔ حیدرآباد میں اس قسم کی کوشش کی سخت تر ضرورت ہے کہ ہندوستان میں جو فرقہ وارانہ بے اعتمادی ہے، وہ دور ہوتی جائے۔

انجمن یہ بات محسوس کرتی ہے کہ باہمی اعتماد کے قوی ہونے کے لیے ملک کے دو اہم فرقے ایک دوسرے کو غالب یا مغلوب نہ خیال کریں۔

جیسا کہ منسلک یادداشت سے واضح ہوگا، ملک میں مشترکہ انتخاب اور بلا تحفظِ نشست غیر فرقہ وارانہ نمایندگی کی ضرورت ہے۔ توقع ہے کہ ایک عظیم تر حیدرآباد کی خاطر سارے جزوی اختلافات خود بہ خود دور ہو جائیں گے، اور جو اصحاب بھی رکن منتخب ہوں ان کا واحد نصب العین محض خدمت ملک رہے گا۔

ایک فارغ البال اور خوش حال حیدرآباد دائمی وقت اپنی برتری کا سکہ چلا سکے گا جب کہ اس کے جمہوری اداروں میں ایسے نمایندے منتخب ہوں جو سارے فرقہ وارانہ جذبات سے پاک ہوں۔

کابینۂ انجمن، دستوری کمیٹی پر اپنے پورے اعتماد کا اظہار ضروری خیال کرتی ہے اور یہ توقع کرتی ہے کہ کمیٹی کے مباحث کا نتیجہ ایک متفقہ غیر فرقہ وارانہ اسکیم کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ بدقسمتی سے ملک میں یہ خیال عام طور سے پھیلا ہوا ہے کہ اصلاحی اور تعمیری کام میں بھی مختلف طبقات کے حیدرآبادی متحد نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال جس قدر جلد دور ہو جائے بہتر ہوگا اور اس کی وجہ سے ملک کی مزید صلاح و فلاح کا سامان مہیا ہوگا۔ توقع ہے کہ دستوری کمیٹی کی رپورٹ سے اس قسم کے خیالات نہ صرف فی الوقت زائل ہو جائیں گے، بلکہ آیندہ پھر کبھی ان کے پیدا ہونے کا احتمال باقی نہ رہے گا۔ یہ امید بے جا نہیں کہ کمیٹی ان اعلیٰ جذبات اور آزاد تصورات سے کام لے گی جو حقیقت میں ملکی ترقی اور قومی برتری کے ضامن ہو سکیں۔

انجمن کی یہ آرزو ہے کہ جناب کی کمیٹی کی مخلصانہ سعی و کوشش سے مملکت آصفیہ کی عظمت و برتری کے لیے متحدہ جد و جہد کا نیا سلسلہ لازوال طور پر شروع ہوگا جب وطن کا

تازہ ولولہ اور خدمتِ ملک کی نئی تپش پیدا ہوگی اور اس کی وجہ سے کیا عجب ہے کہ اس سنسانی کے عالم میں حیات و تازگی کے جسد میں قوت و جوش کی روح از سرِ نو بھرنے کے لیے کوئی پُرزور تگ و پو پھر آغاز ہو اور سلطنت آصف جاہی کی قدر و منزلت کی بقا کے لیے سب فرزندانِ وطن پھر ایک جدید راہِ عمل میں گام زن ہوں اور اس طرح ملک کی آیندہ نسلیں زیادہ باوقار اور زیادہ سربلند ہوں۔

نہ صرف انجمن طیلسانئین عثمانیہ بلکہ ملک کے تمام بہی خواہوں کی ساری تمنائیں اس نقطہ پر قایم ہیں کہ "حیدرآباد کا نام تمام دنیا میں روشن دماغی، آزادانہ ترقی، اور ہر شخص کے لیے سرچشمۂ ہدایت کا مترادف بن کر گونج اُٹھے" اور سلطنت آصف جاہی کے زیرِ سایہ اعلیٰحضرت بندگانِ عالی متعالی نواب میر عثمان علی خاں بہادر مدظلہ العالی اپنے تاریخی زرین روایات کے ساتھ قوی تر اور زیادہ پائدار ہو۔ ملک منتظر ہے کہ دستوری کمیٹی ان آرزوؤں کی تکمیل کے لیے کیا قدم اُٹھاتی ہے۔"



*

یادداشت

دوصدیوں کا طویل زمانہ گزر چکا جب کہ حضرت مغفرت مآب آصف جاہِ اول نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی۔ مغفرت مآب نے جن اصولوں کو اپنی کار فرمائی کی اساس قرار دی وہ ہر کامل اور بلند سے بلند سیاست رانی کے ہم پلہ ہے۔ ایسے زمانے میں جب کہ مغلیہ شاہنشاہی میں آثار ضعف پیدا ہو کر ہر طرف ناروا قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ آسایش و فلاحِ رعایا کی خاطر مغفرت مآب نے "دستوری بادشاہت" کی مثال قایم کرنے کی کوشش فرمائی، اور عملاً یہ ثابت کر دکھایا کہ سرکار آصفی اور رعایائے آصفیہ دونوں کا ایک مقصد اور ایک ہی مطمح نظر ہے، جو دستوری اور قانونی حقوق حضرت مغفرت مآب نے رعایائے آصفیہ کو عطا فرمائے وہ قوموں کو شیر و شکر کرنے کا سبب ٹھیرے۔

چند اہم اصول جن پر مغفرت مآب نے اپنی حکمرانی کی بنا رکھی حسب ذیل ہیں :-

۱۔ بادشاہ کو بذاتہ قتل کا حق نہیں ہے۔ شریعت (قانون) کے مطابق حکم جاری ہونا چاہیے۔

۲۔ تمام سزائیں بالکل قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ حکام عدالت کو ہی دینی چاہیے۔ ان پر کسی طرح کا کوئی ناجایز دباؤ نہ پڑنا چاہیے۔

۳۔ ناجایز محاصل کا بار ہرگز رعایا پر نہ ڈالا جانا چاہیے۔

۴۔ مذہبی آزادی سب کو حاصل رہے اور رواداری برتی جائے۔

۵۔ رُوسائے غیر سے مسالمت برتی جائے۔

(ماخوذ از وصایا آصف جاہ بہ ناصر جنگ شہید)۔

زمانۂ مابعد میں رُوسائے سلطنتِ آصفیہ نے انھیں اصولوں کو اپنی حکمرانی کی بھی اساس قرار دی۔

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی سلور جوبلی کی تقریب مسعود کے موقعے پر صدرِ اعظم وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت نے نہایت صحیح طور سے ارشاد فرمایا تھا کہ:-

"حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اوّل نے دکن میں تختِ آصفی کی بنیاد رعایا کے ساتھ شفقت، محبت، بے تعصبی اور رعایا کے ہی فائدہ کے لیے حکومت کے زرین اصول پر قایم فرمائی، اور دو صد سالہ عہدِ آصفیہ میں ہمیشہ استواری کے ساتھ ان ہی اصول پر فرماں فرمائی کا سلسلۃ الذہب قایم ہے۔" (سپاس نامہ منجانب رعایا)۔

تا آں کہ نواب مختار الملک مرحوم نے ملک کے نظم و نسق کو نئے سانچوں میں ڈھالنا شروع کیا۔ گو اس وقت تک آصفی اصول حکمرانی برابر مدارِ عمل رہے، لیکن ابھی "دستور" اپنے عصری مفہوم میں قایم ہونے نہ پایا تھا، شخصی اور ذاتی حکمرانی کی حیثیت برقرار رہی۔ البتہ یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں مجالسِ صفائی کا قیام عمل میں آیا، اگرچہ حقِ انتخاب رعایا کو عطا نہیں ہوا، لیکن اراکین غیر سرکاری کے تقرر کا آغاز ہو گیا۔

بہرحال حضرت غفراں مکاں میر محبوب علی خاں نے ۷ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ مطابق ۳۰ اسفندار ۱۲۹۳ف کو زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی اور قلمدان وزارت نواب عماد السلطنت مرحوم کو عطا ہوا۔ نوجوان شاہ و وزیر نے طے کر دیا کہ نئی صدی کے ساتھ ساتھ اُمورِ ملک کا انصرام ایک ضابطہ و آئین کے تحت مشورے سے انجام پانا چاہیے۔ چنانچہ مسند نشینی کے تیسرے ہی ہفتے میں سلخ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ کو پہلی دفعہ "کونسل آف اسٹیٹ" کا اجلاس منعقد ہوا۔ حضرت غفراں مکاں نے اس یادگار تاریخی موقع پر جو گہر ریز کلمات ارشاد فرمائے وہ مملکتِ آصفیہ کی دستوری تاریخ میں ہمیشہ آبِ زر سے لکھے جائیں گے۔ حضرت غفراں مکاں نے ارشاد فرمایا کہ:-

"آج شاید حیدرآباد کی تاریخ میں یہ اوّل روز ہے کہ یہاں کے اُمراء بالاتفاق رئیسِ وقت کے سامنے سرکاری کاموں کی مدد دینے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے تجویزوں کا بہت کم رواج ہے۔ ...... میری بڑی خوشی تھی کہ یہ کونسل مقرر ہو ...... اور میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ آپ لوگ اپنی ذاتی اغراض کو

سرکاری کاموں میں راہ نہ دو گے اور سب مل کر بالاتفاق کام کرو گے۔ آپ لوگ اگر چاہو تو اپنے ملک کی بہت بھلائی کر سکتے ہو اور ملک کی بھلائی میں میری بھلائی اور عین آپ کی اپنی بھلائی ہے اس واسطے میں ہرگز پسند نہ کروں گا کہ کوئی رکن اپنی رائے کے خلاف کسی امر میں میری رائے کی تقلید کرے بلکہ مجھ کو یہ امید ہے کہ آپ لوگ ہر مقدمہ میں نیک نیتی اور خیر خواہی کے ساتھ آزادانہ رائے دو گے....

آپ لوگ یقین جانو کہ مجھے ہر فرقہ و ہر گروہ کی رعایت مدنظر ہے میں نہیں چاہتا ہوں کہ کسی کے واجبی حقوق تلف ہوں۔ میں سرکار و رعایا دونوں کے حقوق کی یکساں حفاظت کروں گا اور امرا کی بھی اسی قدر رعایت کروں گا جس قدر غربا کی۔"

(جریدہ اعلامیہ ۴؍ رجمادی الاول ۱۳۰۱ھ صفحہ ۱۴)

ابتدا میں بہ ذریعۂ فرمان مبارک مورخۂ غرۂ ذی حجہ ۱۳۰۲ھ حکم صادر ہوا کہ وضع قوانین کا کام بھی اسی کونسل میں انجام پائے (جریدہ اعلامیہ مورخۂ ۱۴؍ ذی حجہ ۱۳۰۲ھ جلد چہارم صفحہ ۲۷۵)۔

کچھ عرصے کے بعد جب "کونسل آف اسٹیٹ" کا عدم و وجود مساوی ہوگیا تو حضرت غفراں مکان نے اصلاح دستورِ مملکت پر پھر توجہ فرمائی اور اسفندار ۱۳۰۲ف مطابق ۱۸۹۲ء میں "مملکت آصفیہ" کے نظم کے لیے ایک جدید ضابطہ مرتب فرما کر بہ نام "قانونچہ مبارک" جاری فرمایا اس جدید دستور سے جو نمایاں تغیر عمل میں آیا وہ یہ کہ "کونسل آف اسٹیٹ" کے بجائے "کیبنٹ کونسل" کا قیام منظور فرمایا گیا اور ایک علٰحدہ "مجلس وضع قوانین" کا انعقاد اس غرض سے کیا گیا کہ قوانین و ضوابط کی تدوین قابل و تجربہ کار ملازمین و غیر ملازمین کی مدد اور مشورے سے کی جائے۔" (فرمان مبارک صادر شدہ بہ وقت قیام باب حکومت)۔

مجلس وضع قوانین کے افتتاح کے موقع پر نواب وقار الامرا مرحوم نے نہایت درست کہا تھا کہ کیسی بڑی تمدنی نعمت رعایائے آصفیہ کو حاصل ہوئی۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اور ممالک میں رعایا کو یہ حق سال ہا سال کی جدوجہد اور بعض وقت بڑی بڑی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا، لیکن حضرت غفراں مکان نے سلطنتِ آصفیہ کے اس اصلی اصول کے لحاظ سے کہ سرکار آصفی اور رعایائے آصفیہ دونوں کا مطمح نظر ایک ہی ہے

یہ حق خود ہی رعایا کو عطا فرمایا۔
اصولِ انتخاب بھی سرکار عالی نے اصولاً طے کر دیا، چنانچہ وکلا اور جاگیرداروں کا تقرر خود اسی زمرے سے بہ ذریعۂ انتخاب عام عمل میں آتا ہے۔
اعلیٰحضرت بندگانِ عالی مدظلہ العالی کی سرپرآرائی کے ساتھ ہی مجلس وضع قوانین میں توسیع پر توجہ مبذول فرمائی گئی۔ ایوان مجلس وضع قوانین کے افتتاح کے موقع پر خورداد ۱۳۳۱ف میں مدارالمہام وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر نے اعلان فرمایا تھا کہ:۔
"مجلس کی اس درخواست کو کہ ارکان غیر ملازم میں تین ارکان کا اضافہ کیا جائے بندگان اعلیٰحضرت قدر قدرت نے منظور فرماکر ارشاد فرمایا ہے کہ چونکہ مجلس نے اب تک قابل تحسین طور سے کام کیا ہے لہٰذا میں اس درخواست کو بالفعل چھ سال کے لیے امتحاناً منظور کرتا ہوں کہ میر مجلس اور نائب میر مجلس کے علاوہ گیارہ ارکان ملازم جو ہیں ان کی تعداد کے مساوی گیارہ ارکان غیر ملازم مقرر کیے جائیں اور اس طور سے ارکان غیر ملازم کی موجودہ تعداد میں تین ارکان کا اضافہ جو ہوگا ان میں سے ایک رکن غیر ملازم کے انتخاب کا حق مجلس صفائی بلدہ کو دیا جائے اور دو ارکان غیر ملازم کا انتخاب اضلاع کے لوکل بورڈ باری باری سے کریں۔"
آٹھ سال کے بعد قیام باب حکومت کے وقت حضور پرنور نے قطعی طور سے یہ طے فرمادیا کہ:۔
"مملکت کے بہترین نظم کے لیے مابدولت کا ارادہ ہے کہ وسعت کے ساتھ زیادہ اجتماعی نہ کہ شخصی اختیارات کا عمل درآمد ہو۔"
(فرمان مبارک دربارہ تنظیم باب حکومت ۲۲ صفر ۱۳۳۸ھ)۔
اس مختصر تاریخی مساحت سے واضح ہوگا کہ:۔
۱۔ رعایا اور سرکار دونوں کے اغراض و مقاصد ایک ہیں یا مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کے الفاظ میں "شاہ و رعیت میں کوئی مغائرت نہیں۔" (سپاس نامہ رعایا بہ وقت سلور جوبلی مبارک)۔
۲۔ امورِ مملکت کے انصرام کے لیے شوریٰ کا اصول طے فرمادیا گیا ہے۔

۴۔ حقِ انتخاب کو بھی اصولاً طے فرما دیا گیا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ شوریٰ میں رعایا کو مزید حصہ ملے اور حقِ انتخاب میں مزید وسعت اور عمومیت پیدا کی جائے اور بہ لحاظ اس کے کہ رعایا اور سرکار کا مقصد ایک ہی ہے سرکارِ عالی بہ راہ رعایا پروری دستوری اصلاحات کی آخری منزل کا اعلان فرما دے۔

قیامِ بابِ حکومت کے موقع پر حضورِ پُرنور نے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"انقلابِ زمانہ، زمانہ حال کی زندگی کے پیچیدہ مسائل، مشرقی اقوام کے جدید سیاسی احساس اور خود اس ملک کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کے نازک مسائل نے ذاتی حکومت کے بار کو اس قدر گراں کر دیا ہے کہ اس سے ایک حد تک سبکدوشی حاصل کرنے کے لیے فوری تدبیر کی ضرورت ہے۔"

(خطبۂ مبارک دربار افتتاح بابِ حکومت ۲۷ صفر ۱۳۳۸ھ)۔

محترم بابِ حکومت نے اپنے قیام کی غرض پوری کر دی ہے اور اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ان ہی وجوہ و اسباب کی بنا پر جو بندگانِ عالی مدظلہ العالی نے قیامِ بابِ حکومت کے لیے ارشاد فرمائے، خود بابِ حکومت کو قوی تر اور زیادہ مستحکم کرنے کے لیے وفادار اور خیراندیش رعایا کو اس امر کا موقع دیا جائے کہ جہاں وہ ایک طرف سرکاری مصالح اور ذمہ داریوں کو بہ راہِ راست سمجھ سکے تو دوسری طرف وہ اپنے جذبات و احساسات، ضروریات و مصالح کو آئین اور ضابطے کے تحت، سرکارِ عالی کے گوش گذار کر سکے۔

مخفی نہ رہے کہ ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی میں مجلس وضعِ قوانین کا قیام محض توضیحِ قانون کی حد تک، اس زمانے میں عمل میں آیا جب کہ برٹش انڈیا میں لارڈ ڈلنسڈون نے اسی سال یعنی ۱۸۹۲ء میں مجالس وضعِ قوانین ہند کی اصلاح و توسیع کر دی تھی، ارکان غیر سرکاری کا انتخاب بہ ذریعہ رائے عام ہونے لگا تھا، ارکان کو حقِ سوال بھی مل چکا تھا اور موازنے پر اظہارِ رائے کیا جا سکتا تھا۔ (ملاحظہ ہو برطانوی ہند کا نظام سیاسی صفحہ ۷۵۔ تالیف ای، اے، ہارن۔ ترجمہ سید نجیب اشرف سلسلۂ جامعہ عثمانیہ)۔

اب حالت یہ ہے کہ برٹش انڈیا کے سارے صوبوں کو حکومت خود اختیاری

مل چکی ہے اور دوسری ہندوستانی ریاستیں تیزروی سے اپنی رعایا کو اپنی ذمہ داریوں میں شریک کر رہی ہیں۔

ممالک محروسہ سرکارعالی میں مجلس وضع قوانین کو قایم ہو کر ۵۴ سال گزر چکے ہیں اور اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا وجود مفید اور صلاح و فلاح رعایا کا موجب ہوا۔ ارکان غیر سرکاری نے بھی اپنے آپ کو اس اعتماد کا پورا اہل ثابت کیا جو ان پر سرکارعالی نے قایم فرمایا تھا۔ انھوں نے یہ امر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اب اس قابل ہیں کہ ان پر مزید اعتماد کیا جائے اور ان کی ذمہ داریوں میں وسعت پیدا کی جائے۔

یہ امر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ ممالک محروسہ سرکارعالی کے خاص حالات اور خاص مسائل ہیں، موجودہ حالات کے تحت جو تجاویز مناسب معلوم ہوئیں ان کو ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے:۔

مجلس وضع قوانین کے آیندہ اختیارات

مناسب ہوگا کہ مجلس وضع قوانین کے فرایض و اختیارات آیندہ حسب ذیل قرار دیے جائیں:۔

۱۔ قانون سازی:۔

الف۔ سرکار کے پیش کردہ مسوداتِ قانون پر غور کرنا۔

ب۔ غیر سرکاری ارکان کے مسوداتِ قانون پر غور کرنا۔

اگر باب حکومت کی رائے میں کسی غیر سرکاری رکن کا مسودۂ قانون ناقابلِ غور قرار پائے اور وہ اس کو مجلس وضع قوانین میں پیش کرنا مناسب نہ خیال کرے تو اس کو بندگان عالی کے ملاحظے میں بہ غرض حصولِ ہدایت پیش کیا جائے گا۔

۲۔ تحریکات منظور کرنا:۔

مجلس کے ہر رکن کو اختیار ہوگا کہ ملک کی ہر جہتی ترقی اور مفاد ملک کے ہر پہلو پر سرکارعالی کو متوجہ کرنے کے لیے تحریکات پیش کرے۔ اگر باب حکومت کو کسی تحریک کے پیش کرنے میں اختلاف ہو تو اس کو بہ غرض حصولِ ہدایت بندگان عالی کے ملاحظے میں پیش کیا جائے گا۔

۳۔ حقِ سوال:۔
مجلس کے ہر غیر سرکاری رکن کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ امورِ نظم و نسق کے متعلق سوالات کر سکے، اور جواب ملنے پر ضمنی سوالات کرے۔ البتہ سرکار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اگر کسی سوال کے جواب دینے سے مفادِ عام کو ضرر پہنچتا ہو تو جواب دینے سے انکار کر دے۔

۴۔ موازنۂ سالانہ پر بحث، اور مداتِ مقررہ پر رائے دہی:۔
سرکارِ عالی سالانہ موازنے کو مجلس وضع قوانین میں پیش کرے گی۔ مجلس اس پر بحث کرے گی اور مناسب تحریکات منظور کرے گی۔ مجلس کے تحریکات بندگان عالی کے ملاحظے میں پیش کر دیے جائیں گے۔ بندگان عالی حکم مناسب صادر فرمائیں گے۔
موازنے کے مداتِ ذیل پر مجلس میں نہ تو بحث ہوگی اور نہ کوئی تحریک ان کے متعلق پیش ہو سکے گی۔

الف۔ مد داخل حضور پرنور، اخراجات متعلق ذاتِ شاہانہ اور شہزادگان و صاحبزادگان کے الونس و اخراجات۔

ب۔ مدات فوج۔

ج۔ مدات امور مذہبی۔

د۔ ٹکس۔

الف۔ اگر سرکار کی رائے میں کسی جدید محصول کا عاید کیا جانا مناسب ہو تو اس کے متعلق مجلس کی رائے حاصل کی جائے گی، اگر مجلس کی رائے میں اس کی ضرورت نہ ہو تو اس کو بندگان عالی کے ملاحظے میں بہ غرض صدور حکم مناسب پیش کیا جائے گا۔

ب۔ مجلس بہ طور خود بھی کسی جدید ٹکس کے عاید کرنے کی تجویز منظور کر سکے گی۔ نیز کسی ٹکس کے تخفیف اور اس کے تنسیخ کے متعلق بھی تجاویز منظور کر سکے گی، اگر سرکار کو اس سے اختلاف ہو تو مجلس کی تجویز بندگان عالی کے ملاحظے میں بہ غرض صدور حکم مناسب پیش کی جائے گی۔

مجلس کے اختیارات پر تحدید

مناسب ہوگا کہ حسب ذیل امور کے متعلق سرکار کے سوا کسی اور رکن کی جانب سے کوئی مسودہ قانون تحریک اور سوال پیش نہ کیا جائے۔

۱۔ ذات شاہانہ اور خاندان شاہی۔

۲۔ فوج۔

۳۔ امورِ مذہبی۔

ایسے معاملات جو کسی خاص مذہب اور فرقے سے متعلق ہوں، یا جن کا مفر اثر خاص طور پر کسی مذہب یا فرقے کے اشخاص پر پڑتا ہو، البتہ اگر اس خاص فرقے کے ارکان مجلس کے منجملہ (۳/۴) تین چوتھائی ارکان اس مسئلے پر بحث کے لیے آمادہ ہوں تو اجازت دی جائے گی۔

۴۔ عطیات شاہی کی عطا اور مسدودی

۵۔ ملازمتیں۔

ایسا قانون یا تحریک، یا سوال جس کا اثر یہ ہو کہ مسئلۂ ملازمت کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔

۶۔ سرکاری زبان۔

ایوانِ مجلس یہ امر مناسب ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے سارے طبقاتِ رعایا میں زیادہ سے زیادہ میل جول پیدا کرنے کے لیے، نیز دو ایوانوں کی خاص طور پر ضرورت نہ ہونے اور کفایت شعاری کے مدِ نظر مجلس کا ایک ہی ایوان ہو۔

مجلس کی ترکیب بہ حالاتِ موجودہ مناسب ہے کہ اس مجلس کے ارکان کی تعداد (۱۰۰) قرار دی جائے اور ان کی تقسیم اس طرح کی جائے :۔

۱۔ عام حلقہ ہائے انتخاب

الف۔ ہر ضلع سے دو ارکان ۳۲ }
ب۔ بلدہ حیدرآباد سے آٹھ ارکان ۸ } ۴۰

نوٹ۔ ضلع کی تعریف میں وہ جاگیرات اور سمستانات وغیرہ بھی داخل ہوں گے جو اس ضلع کے حدود اراضی میں داخل ہوں۔

۲۔ جاگیرداروں سے ۲۰

نوٹ۔ یہ نشستیں صرف خاص مبارک، پائیگاہوں، اُمرائے عظام، سمستانوں اور جاگیرداروں

کے لیے ہوں گے۔

۳۔ جامعہ عثمانیہ۔ ۵

۴۔ سرکاری نام زد کردہ ارکان۔

الف۔ ملازم سرکار ۱۵ }
ب۔ غیر ملازم ۲۰ } ۳۵

نوٹ۔ (۲۰) ارکین غیر ملازم کو سرکار عالی مختلف مفادات کے تحفظ کے لیے بہ ذریعہ نام زدگی یا خود اہل مفاد کے باہمی انتخاب کے ذریعے پر کرے گی۔

طریقۂ انتخاب یہ امر مناسب ہے کہ عام حلقوں میں نمایندگی اور انتخاب بہ ذریعہ عام رائے دہی کے اور بلا تحفظ نشست ہو، انتخاب راست عمل میں آئے۔

حقِ رائے دہی عام طور پر حقِ رائے دہی کی متعدد اور مختلف بنیادیں تسلیم کی جاتی ہیں، لیکن انجمن طیلسانیئن عثمانیہ تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت ہونے کی وجہ سے، نیز بہ لحاظِ حالات ملک نوشت و خواندگی اہلیت کے سوا رائے دہی کے لیے اور کسی بنیاد کو تسلیم نہیں کرتی۔ صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی طریقۂ حکمرانی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر حقِ رائے دہی کی بنیاد نوشت و خواند کو قرار دیا جائے تو ملک کی تعلیمی حالت بہت جلد ترقی کر جائے گی۔

بہ ہر حال حقِ رائے دہی کی بنیاد صرف یہ قرار دینی مناسب ہوگی کہ ہر شخص جو ملک کی کسی مسلمہ یا مروجہ زبان میں لکھ پڑھ سکتا ہو رائے دہنے کا مجاز قرار دیا جائے۔ بہ شرطیکہ رائے دہندہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں پانچ سال اقامت پذیر رہا ہو۔

اعلان حکومت ذمہ دارانہ یہ امر محسوس کیا جاتا ہے کہ ان سب اصلاحات کا مدعا ایک ایسا دستور ہے کہ جس کی رو سے کامل ذمہ دار حکومت قایم ہو جائے اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ سرکار عالی یہ اعلان فرمادے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں خانوادۂ آصفی کے زیر سایۂ عاطفت اور شاہی اقتدارات کے کامل تحفظ کے ساتھ ذمہ دار حکومت کا قیام اس کے پیش نظر ہے۔

کامل توقع ہے کہ ان تجاویز کی منظوری اور نافذ کرنے سے حضرت بندگان عالی کے منشائے مبارک کی تکمیل ہوگی، اور صلاح و فلاح رعایا، اور سود و بہبود ملک کی ایک اور سبیل ہو جائے گی۔ فقط

قواعد معاشی کمیٹی

منظورہ جلسہ عام کاروباری انجمن طیلسانئین عثمانیہ منعقدہ ۲۷ دے ۴۷ف

ف ۱۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی ایک مستقل ذیلی کمیٹی بہ نام "معاشی کمیٹی" قایم رہے گا۔ اس کا نام "معاشی کمیٹی حیدرآباد" ہوگا۔

ف ۔ یہ کمیٹی انجمن طیلسانئین عثمانیہ سے ملحق ہوگی، اور اس کے قواعد و ضوابط تابع منظوری انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہوں گے۔

ف ۲۔ اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے:۔

ا۔ ملک کی معاشی ترقی کے لیے جد وجہد کرنا۔

ب۔ تعلیم یافتہ افرادِ ملک اور بالخصوص فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی معاشی زندگی کی جد وجہد میں ان کا ہاتھ بٹانا۔

ف ۳۔ معاشی کمیٹی میں ہر وہ شخص شریک ہو سکے گا جو کمیٹی کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھتا ہو، اور جس کی رکنیت کو کمیٹی کی مجلس عاملہ منظور کرے۔

ف ۴۔ کمیٹی کی رکنیت کا چندہ (عہ) سالانہ ہوگا، لیکن ارکان انجمن طیلسانئین عثمانیہ بلا ادائی چندہ کمیٹی کے رکن متصور ہوں گے۔ البتہ انجمن طیلسانئین عثمانیہ اپنے ارکان کے سالانہ چندۂ موصولہ کا آٹھواں حصہ ہر سال "معاشی کمیٹی" کو دیا کرے گی۔

ف ۵۔ معاشی کمیٹی کو اختیار رہوگا کہ علاوہ زرِ رکنیت کے مزید عطیات کی وصولی کے لیے مناسب

انتظام کرے۔

ف ۶ ۔"معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ حسب ذیل ہوگی :۔

۱۔صدر ۔ ۲۔معتمد ۔ ۳۔نائب معتمد ۔

ا۔چار ارکان جنھیں کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ نامزد کرے گی۔

ب۔چار ارکان جن کا سالانہ انتخاب، صدر ۔نائب صدر و معتمد کے سوا کمیٹی کا جلسۂ عام ہر سال بہ ماہ آبان بہ ذریعۂ خفیہ رائے دہی کرے گا۔

ف ۷ ۔کوئی شخص نہ تو انتخاب میں امیدوار ہو سکے گا، اور نہ رائے دے سکے گا، تاوقتیکہ اس نے اپنے ذمگی جملہ مطالبات اعلانِ انتخاب سے قبل ادا نہ کر دیے ہوں۔

ف ۸ ۔استعفا، یا کسی اور وجہ سے مجلسِ عاملہ کی رکنیت خالی ہو تو خود مجلسِ عاملہ باقی مدت کے لیے نیا انتخاب عمل میں لائے گی۔

ف ۹ ۔معاشی کمیٹی کے صدر کے فرائض حسب ذیل ہوں گے :۔

۱۔کمیٹی کا کاروبار مسلسل اور خوش اسلوبی سے چلتے رہنے کی نگرانی۔

۲۔کمیٹی کے جلسوں کی صدارت ۔

۳۔کمیٹی کے ہر جلسے میں جلسۂ ماقبل کی روئداد سُن کر حسب صوابدید ارکان حاضر توثیق ۔

۴۔کمیٹی کے جلسوں میں بہ صورت تساوی آرا فیصلہ کُن رائے کا اظہار۔

۵۔کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ اور دفاتر سرکاری سے جو مراسلت عمل میں آئے اس کے مسودات کی توثیق۔

۶۔کمیٹی کے عام امُور کے متعلق معتمد کو ہدایت دینا۔

ف ۱۰ ۔"معاشی کمیٹی" کے معتمد کے فرائض حسب ذیل ہوں گے :۔

۱۔جو امُور کمیٹی کے جلسوں میں طے ہوں، ان کی تعمیلی کارروائی۔

۲۔منجانب کمیٹی مراسلت ۔

۳۔کمیٹی کے جلسوں کی روئداد کی ترتیب ۔

۴۔بعد مشورہ صدر کمیٹی کے جلسوں کے اطلاع نامے جاری کرنا۔

۵۔ کمیٹی کے حسابات کی ترتیب۔ ۶۔ کمیٹی کے دفتر کی حفاظت اور نگرانی

دفعہ ۱۱۔ "معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ کے فرایض و اختیارات حسب ذیل ہوں گے:۔

ا۔ مجلسِ عاملہ ہر سال موازنہ منظور کرے گی۔

ب۔ مختلف مقامات میں کمیٹی کی شاخیں قایم کرے گی۔

ج۔ کمیٹی کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے طریقہ ہائے کار سوچے گی، اور انھیں بروئے کار لانے کی تدابیر اختیار کرے گی۔

د۔ حسب ضرورت ملازموں کو مقرر اور علٰیحدہ کرے گی۔

ھ۔ حسابات کی تنقیح کے لیے ہر سال تنقیح سازوں کو مقرر کرے گی۔

و۔ کمیٹی کے جلسۂ عام کے انعقاد کی تاریخ مقرر کرے گی، اور ان کے سلسلے میں سب انتظامات کے لیے معتمد کو ہدایات دے گی۔

ز۔ نائب معتمد کے فرایض کا تعین۔

دفعہ ۱۲۔ مجلسِ عاملہ کا کوئی رکن، یا کمیٹی کا کوئی عہدہ دار بلا اطلاع تحریری مجلسِ عاملہ کے تین جلسوں میں مسلسل غیر حاضر رہے تو ایسا شخص رکنیت یا عہدے پر باقی نہ رہے گا۔

دفعہ ۱۳۔ ہر ماہ ایک مرتبہ "معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ منعقد ہوگا، لیکن تین ارکان کی تحریری درخواست پر معتمد کا فرض ہوگا کہ بہ مشورۂ صدر کمیٹی مجلسِ عاملہ کے جلسے کا انعقاد عمل میں لائے۔

دفعہ ۱۴۔ کسی غیر معمولی اہم مسئلے کے تصفیے کے لیے صدر "معاشی کمیٹی" کو اختیار حاصل ہوگا کہ مجلسِ عاملہ کا جلسہ طلب کرنے کے لیے معتمد کو تحریری ہدایت دے۔

دفعہ ۱۵۔ "معاشی کمیٹی" کا جلسۂ عام سال میں کم از کم ایک مرتبہ ارکین مجلسِ عاملہ کے انتخاب اور سالِ ماسبق کی کارروائیوں پر بحث و تبصرہ کرنے کے لیے ماہ آبان میں منعقد ہوگا، لیکن مجلسِ عاملہ اگر چاہے تو غیر معمولی جلسہ ہائے عام بھی منعقد کر سکے گی۔

دفعہ ۱۶۔ اگر "معاشی کمیٹی" کے دس ارکان معتمد سے کسی خاص مسئلے کے لیے غیر معمولی جلسۂ عام کے

انعقاد کی تحریری خواہش کریں تو معتمد کا فرض ہوگا کہ یہ اطلاع مجلسِ عاملہ دو ہفتے کی مدت میں جلسہ منعقد کرے۔

دفعہ ۱۷ ۔"معاشی کمیٹی" کے مختلف جلسوں کا نصاب بہ موجب تفصیل ذیل ہوگا:۔

۱۔ جلسۂ عام ایک ثلث، یا (۱۵) ارکان کی حاضری۔

۲۔ مجلسِ عاملہ، (۴) ارکان کی حاضری۔

دفعہ ۱۸ ۔معتمد کا فرض ہوگا کہ "معاشی کمیٹی" کے جلسوں کی تاریخ سے اتنی مدت قبل جو ہر جلسے کے محاذی ذیل میں درج ہے، جمیع ارکان متعلقہ کو اطلاع دے:۔

۱۔ ماہانہ مجلسِ عاملہ	ایک روز
۲۔ جلسہ ہائے عام	ایک ہفتہ

دفعہ ۱۹ ۔اگر "معاشی کمیٹی" کی مجلسِ عاملہ ضرورت سمجھے تو علاوہ جلسہ ہائے عام کے ایک عام معاشی کانفرنس سال کے کسی مہینے میں منعقد کر سکے گی۔

دفعہ ۲۰ ۔ہر سال صدر اور معتمد "معاشی کمیٹی" کی آمدنی اور خرچ کا موازنہ تیار کر کے مجلسِ عاملہ میں بہ غرض منظوری پیش کریں گے۔ اس موازنے کے اندر خرچ کا اختیار معتمد کو بہ منظوری مجلسِ عاملہ حاصل ہوگا۔ باقی جملہ رقم کسی بنک میں جس کی منظوری مجلسِ عاملہ نے دی ہو بہ مدِ امانت رکھی جائے گی، اور اس کی داد و ستد صدر کمیٹی کے توسط سے ہوگی۔

دفعہ ۲۱ ۔ان قواعد میں ترمیم مجلسِ عاملہ کر سکے گی، جو تابع منظوری انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہوگی۔

دفعہ ۲۲ ۔اگر کوئی رکن پندرہ ارکان کی دستخطی تائید کے ساتھ کسی عہدہ دار، یا رکن مجلس عاملہ کے خلاف قرارداد عدم اعتماد کی تحریک کرے تو معتمد کا فرض ہوگا کہ ایک ہفتے کے اندر کمیٹی کا ایک جلسۂ عام طلب کر کے اس تحریک کو پیش کرے۔ اگر تحریک بہ غلبۂ آرا منظور ہو جائے تو اس عہدہ دار یا رکن کو فوراً مستعفی ہو جانا پڑے گا۔ فقط

عثمانئین کی کتابیں

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۱۔ اُردو شہ پارے جلد اوّل .... ۱۲/ لے
۲۔ روحِ تنقید .... ۱۲/ عہ
۳۔ تنقیدی مقالات .... ۱۲/ ہے
۴۔ اُردو کے اسالیب بیان .... ۱۲/ عہ
۵۔ ہندستانی لسانیات .... عاں
۶۔ تین شاعر (میر تقی میرؔ، میر حسنؔ اور میر انیسؔ) عہ
۷۔ دیوان زادہ حاتم ....
۸۔ تازیانہ (ایک معاشرتی قصہ) ....
۹۔ طلسمِ تقدیر (حیدرآباد سے متعلق ایک نیم تاریخی قصہ) ۸/
۱۰۔ گارساں دتاسی، مجلد .... ۱۲/ لے
۱۱۔ گلزار ابراہیم، مجلد .... ۲/ ہے
۱۲۔ محمود غزنوی کی بزمِ ادب ۱۲/
۱۳۔ فنِ انشا پردازی .... ۱۲/ عہ
۱۴۔ عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی .... ۸/ عہ
۱۵۔ کیفِ سخن (کلام کیفی حیدرآبادی) ... ۱۲/
۱۶۔ متاعِ سخن (کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز) ۱۲/
۱۷۔ بادۂ سخن (کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل) ۱۲/
۱۸۔ مرقعِ سخن، جلد اوّل و دوم، فی جلد صہ/
۱۹۔ سیر گولکنڈہ ۱۵/
۲۰۔ گولکنڈے کے ہیرے، مجلد ۱۲/

۲۔ پروفیسر عبدالقادر سروری

۱۔ دنیائے افسانہ .... ۸/ عہ
۲۔ کردار اور افسانہ .... ۱۲/ عہ
۳۔ جدید اُردو شاعری، مجلد .... ے
۴۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی .... عہ
۵۔ چینی اور جاپانی افسانے ۹/
۶۔ انگریزی افسانے .... ۱۲/ عہ
۷۔ سراج سخن (کلام شاہ سراج اورنگ آبادی) .. ۱۲/

۳۔ سید محمد ام، اے

۱۔ اربابِ نثرِ اُردو (فورٹ ولیم کالج کے اُردو نثر نگاروں کا تذکرہ) عاں
۲۔ مثنویاتِ میرؔ .... عاں
۳۔ گلشنِ گفتار (اُردو شعرا کا قدیم ترین تذکرہ) ... ۱۲/
۴۔ قصائدِ ایمان ۸/
۵۔ ایمانِ سخن (کلام شیر محمد خاں ایمان) ۱۲/
۶۔ ابتدائی قواعدِ فارسی ۱۲/
۷۔ یادگارِ روحی .... عاں

۴۔ گرو داس ام، اے، ال، بی

۱۔ جیون چرتر راجہ گیج رائے انجہانی کی سوانح عمری۔

۵۔ میر حسن ام، اے

۱۔ ورڈسورتھ اور اُس کی شاعری ...... ۸؍

۲۔ ہوش کے ناخن (ڈراما) ...... (۱۰؍)

۶۔ مخدوم محی الدین ام، اے

۱۔ ٹیگور اور اُن کی شاعری ...... عہ

۷۔ نبی الحسن شمیم بی، اے

۱۔ شعاعِ امید (مصنف کی نظموں کا مجموعہ) ......

۲۔ شمیمِ سخن (〃 غزلیات کا مجموعہ) ......

۳۔ عالمِ حسیات (〃 غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) ...

۸۔ احمد بن عبداللہ بی، اے

۱۔ کیفی تشریح (طلبائے انٹر سائنس کے لیے) .... ۱۲؍

۲۔ عملی کیمیا (طلبائے انٹرمیڈیٹ کے لیے) عالؔ ۸؍

۹۔ اعظم خاں ام، اے

۱۔ سید الانبیاء (کارلائل کے مشہور لکچر ہیرایز کا اُردو ترجمہ) عہ

۲۔ رہنمائے صحت (مہاتما گاندھی کی کتاب گائڈ ٹو ہیلتھ کا اردو ترجمہ) عہ

۱۰۔ وینکٹ پرشاد بی، اے، ال، بی

۱۔ حیدر آباد اور ہندو مسلم زندگی ..... ۶؍

۱۱۔ ڈاکٹر سید جعفر حسن پی، اچ، ڈی (لندن)

۱۔ منتخبات کلامِ ہندی (ہندی کلام، اُسکی تشریح و تبصرہ) عالؔ ۱۲؍

۱۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ پی، اچ، ڈی (جرمنی)

۱۔ نیلگری (نیلگری کے متعلق عام فہم معلومات) .... ۴؍

۲۔ قانون بین الممالک .... عہ

۱۳۔ سدرشن راج ام، ایس، سی

۱۔ طبعیات مکمل (عثمانیہ میٹرک کے طلبائے سائنس کے لیے)

۱۴۔ سردار خاں بی، اے

۱۔ جدید نصاب طبعیات (دو جلدیں عثمانیہ میٹرک کیلیے) فی جلد عہ

۲۔ جدید نصاب کیمیا (〃 〃) عالؔ

۱۵۔ عباس حسین لطفی

۱۔ مصنوعی بیوی (ایک دلچسپ انگریزی ناول کا ترجمہ) ۱۲؍

۱۶۔ محمد عبدالرحمٰن مدیر "وقت"

۱۔ قواعد اُردو (طلبائے مدارس وسطانیہ کے لیے) ۱۲؍

۲۔ سیرت و کردار (بچوں کے لیے اخلاق کی کتاب) ... ۸؍

۱۷۔ محمد عبدالحفیظ بی، اے، بی، ٹی، ام، اے، ڈاؤنبرا)

ایف، ایس، سی (لندن)

۱۔ مبادی کیمیا حصہ اوّل و دوم و سوم فی جلد ... ۱۲؍

۲۔ حفظ صحت (طلبائے مدارس کے لیے) .... ۴؍

۱۸۔ محمد عبدالسلام ذکی بی، اے، ٹی، ڈی

۱۔ شہادت نامہ (حضرت امام حسینؑ کے واقعاتِ شہادت) عہ

۲۔ گلزارِ اطفال (بچوں کے لیے) .... (۸؍)

۳۔ گلزارِ حکایات (〃) (۶؍)

۴۔ جذباتِ عالیہ (حمد اور قومی نظموں کا اردو ترجمہ ۸؍

۵۔ شرح نصاب اردو حصہ اوّل ..... ۸؍

۶۔ 〃 〃 〃 دوم عہ

۷۔ آصفی کہانیاں ....۸؍

۱۹۔ شیخ چاند مرحوم ام اے ال ال بی

۱۔ ملک عنبر .... ۸ عہر

۲۔ ایکناتھ .... عہ

۳۔ سودا (مقالۂ تحقیقی) .... ۱۲/ ہے

۲۰۔ ابوالمکارم فیض محمد صدیقی بی اے ڈپ ایڈ

۱۔ ابتدائی الجبرا (عثمانیہ میٹرک کے لیے) ..... ۸ عہر

۲۔ حساب .... ۸ عہر

۳۔ مطالعۂ قدرت حصۂ اول ۱۲/

۴۔ جدید نصاب طبعیات .... عاں

۵۔ مصلحان تعلیم .... ۸/ عہر

۶۔ ابن سعود .... ۸/ عاں

۷۔ مسز بیسن .... عہ

۲۱۔ محمد امیر بی اے، بی، ٹی

۱۔ سلیم (مولانا وحید الدین سلیم مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ) عہ

۲۔ شیب وشباب (براؤننگ کی مشہور آفاق نظموں کا ترجمہ) ۲/

۲۲۔ پروفیسر ڈاکٹر میر ولی الدین

۱۔ فلسفہ کی پہلی کتاب (فلسفہ کی ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ) ۸/

۲۔ مقدمہ مابعد الطبعیات ....

۳۔ ابطال مادیت ....

۴۔ قنوطیت یعنی فلسفۂ یاس (خیر وشر وغایت حیات) عاں

۲۳۔ مخدوم علی

۱۔ جغرافیہ سلطنت آصفیہ (مدارس کے لیے) ۸/

۲۔ جغرافیہ عالم .... ۸ عہر

۳۔ جغرافیہ کی تعلیم (جغرافیہ پڑھانے کا عام طریقہ) ..... (۱/)

۴۔ ذہنی حساب (مدارس کے لیے) ۲/

۵۔ رفیق مدرسین ۸/

۶۔ دو صد سالہ جنتری ۲/

۷۔ سلیس کہانیاں (بچوں کے لیے) ۲/

۲۴۔ سید معین الدین قریشی ام اے

۱۔ غالب (ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی انگریزی کتاب "غالب" کا اردو ترجمہ) .... ۸ عہر

۲۵۔ محمد منیر الدین ام اے ڈپ ایڈ (ایڈنبرا)

۱۔ مکمل مندسۂ علمی (طلبائے عثمانیہ میٹرک کے لیے) ..... ۴ عہر

۲۔ حل پرچہ جات ریاضی (امتحانات عثمانیہ میٹرک کے لیے) ۴ عہر

۲۵۔ میر حسن الدین بی اے ال ال بی

۱۔ مبادی فلسفہ (فلسفہ پر عام فہم کتاب) ۱۴/

۲۔ فلسفۂ عجم (ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے مشہور مقالے کا اردو ترجمہ) ۸/ عاں

۳۔ برگسان (مشہور فلسفی برگسان کے اصول و نظریات) ۴ عہر

۴۔ دقائق اور ریاستیں ۱۲/

۲۶۔ سید وقار احمد ام اے ال ال بی

۱۔ براؤننگ (براؤننگ کی بعض نظموں کا نفیس ترجمہ اور ان پر تبصرہ) .... عہ

۲۔ ہنری چہارم (شکسپیر کے مشہور ڈرامے کا اردو ترجمہ) عہ

۲۷- انوار حسین بی، اے

۱- جبر و مقابلہ (مدارس وسطانیہ کے لیے) ... ۱۵؍

۲- جغرافیہ طبعی (" ") ... (۱۰؍

۲۸- محمد عبد الشکور بی، اے

۱- التدبیر (ایک معاشرتی ناول) ...... ۸؍

۲۹- عبد القادر وفا (عثمانیہ)

۱- خواب راحت (فلمی ڈراما) ....

۲- دیوان وفا ....

۳۰- احمد عبد اللہ المسدوسی بی، اے ال، ال بی

۱- اسوۂ حسنہ (آنحضرت صلعم کے اخلاق و عادات کا مرقع) ۸؍

۳۱- عبد اللطیف بی، اے

۱- عملی ہندسہ (عثمانیہ میٹرک کے لیے) ...... ۱۲؍

۲- علم مساحت (" ") ..... ۱۲؍

۳۲- محمد عبد الوہاب بی، اے، بی، ای

۱- جداول ریاضیہ (طلبائے مدارس کے لیے) ....

۳۳- عزیز احمد بی، اے

۱- فرانسیسی افسانے (فرانسیسی افسانوں کا اردو ترجمہ) ۱۲؍

۳۴- غلام طیب بی، اے

۱- دیسی کہانیاں (بچوں کے لیے) ....

۳۵- محسن بن شبیر بی، اے

۱- یوسف ہندی قید فرنگ میں ...... عہ

۳۶- محشر عابدی بی، اے

۱- محشرستان (مصنف کے افسانوں کا مجموعہ) ... عہ۸؍

۳۷- محمد احمد عثمانی بی، اے، ام، ایس سی

۱- طبعیات عملی (انٹرمیڈیٹ سائنس کے لیے) عا۸؍

۲- مبادی سائنس (طبعیات کا ابتدائی رسالہ)

۳۸- نجم الغنی (عثمانیہ)

۱- خیالات عالیہ (امریکن اور دوسرے مصنفین کے مضامین کا ترجمہ) عاں

۳۹- ندیم الحسن تاثیر بی، اے

۱- اردو کی قومیت (اردو زبان کی سرگذشت)

۴۰- نور اللہ محمد نوری

۱- شرح انتخاب دیوان غالب ...... ۱۲؍

۲- داغ (داغ دہلوی کے حالات اور کلام کی تنقیدی تحسین) .... عا۸؍

۴۱- میر محمود علی ام، اے

۱- آصف جاہ ثانی (نواب میر نظام علی خاں کی سوانح عمری) .... عا

۲- گلدستۂ تاریخ (عثمانیہ میٹرک کے لیے) ۱۲؍

ملنے کے پتے: ۱- مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔ ۲- غلام دستگیر تاجر کتب حیدرآباد دکن۔ ۳- سید عبد الرزاق تاجر کتب چار مینار حیدرآباد دکن۔ ۵- مکتبۂ جامعہ قرول باغ دہلی۔ ۶- دفتر مجلس علمیہ گھانسی بازار حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مطبوعات

۱۔ **مرقعِ سخن** (جلد اول) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر۔ مجلد قیمت (صہ) اس بیش قیمت کتاب کے اب صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔

۲۔ **مرقعِ سخن** جلد دوم، حیدرآباد کے دیگر پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر قیمت مجلد صہ۔ اس جلد میں ان سلاطین خانوادۂ آصفی کے اور امرائے کبار کے تذکرے بھی درج ہیں جن کی شاعری یا علم دوستی قابلِ ذکر ہے۔

۳۔ **سراجِ سخن** حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی صفحے (۱۵۲) قیمت (۱۲ر) مع تصویر خطِ سراج۔

۴۔ **ایمانِ سخن** استاد الشعرا شیر محمد خاں ایمان حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از مولوی سید محمد ایم اے لکچرار اردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد (۱۲۰) صفحے۔ ایمان عہدِ آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرائے دکن تھے۔

۵۔ **فیضِ سخن** استادِ کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیاتِ اردو جامعہ عثمانیہ (۱۴۴) صفحے قیمت (۱۲ر) مع تصویر درگاہ فیض۔

۶۔ **بادۂ سخن** ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیاتِ اردو جامعہ عثمانیہ (۱۲۸) صفحے قیمت (۱۲ر) مع تصویر شاعر۔

۷۔ **کیفِ سخن** سید ضیاء الدین حسن کیفی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور (۱۲۲) صفحے قیمت (۱۲ر)

۸۔ **متاعِ سخن** نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب ″ ″ (۱۲۵) صفحے قیمت (۱۲ر) مع تصویر شاعر

۹۔ **نقدِ سخن** کلام فانی پر ناقدانہ تنقید، از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز۔

۱۰۔ **ورڈسورتھ اور اس کی شاعری** انگلستان کے مشہور شاعر کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام جس نے اردو کی فطری شاعری کو خاص طور پر متاثر کیا، از مولوی میر حسن صاحب ایم اے (۱۸۴) صفحے قیمت (عہ) مع تصویر شاعر

۱۱۔ **ٹیگور اور انکی شاعری** ہندوستان کے مشہور شاعرِ اعظم کے حالاتِ زندگی اور تصنیفات پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے (۱۲۸) صفحے قیمت (عہ)

۱۲۔ **ہوش کے ناخن** حیدرآباد کی زندگی کا ایک مرقع جو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان ایم اے (۹۶) صفحے قیمت (۱۲ر)

۱۳۔ **یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں** مرزا غالب مرحوم کے واقعۂ قید کا مستند تذکرہ از مولوی محمد حسن بن شبیر صاحب صبابی بی اے ال ال بی (۸۰) صفحے قیمت (۸ر)

۱۴۔ **نذرِ ولی** بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں طلبائے جامعہ عثمانیہ کی نذرِ عقیدت (۲۵۰) صفحے قیمت مجلد (عہ)

المشتہر

خواجہ حمید الدین مہتمم ادارۂ ادبیاتِ اردو

۳۸ء کی چند مطبوعات

دلی کا سنبھالا:۔ از خواجہ محمد شفیع (دہلوی) مرحوم دہلی کے ایام عروج کی مرقع نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جواب نابود ہے، انداز بیان ایسا موثر ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے قیمت مجلد ۲عہ

لطائف غالب: مسز ایم اے شاہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخیٔ بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے۔ قیمت (۳؍)۔

شعلۂ طور (طبع ثانی): حضرت جگر مراد آبادی کے کلام کا مجموعہ، بالکل نئی ترتیب بہت کچھ تازہ کلام کا اضافہ قیمت بھی کم کر دی گئی ہے یعنی (عـــہ) کے بجائے (عاؔ)۔

سبد چین:۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں ان کے وہ فارسی قطعات، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیاں شامل ہیں جو ان کی کلیات میں موجود نہیں ہیں مع مکمل سوانح حیات قیمت (۲؍)

ذکر غالب:۔ مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند ترین سوانح عمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں اور جو طلباء کے لئے خاص طور سے بہت مفید ہے۔ قیمت (۸؍)۔

قرآن کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا؟ از عبدالواحد (سندھی) استاد مدرسہ جامعہ، بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مدنظر رکھ کر تیار کی گئی ہے۔ مسلمان بچوں کے لئے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی۔ قیمت (۶؍)۔

دلی:۔ بچوں کے لئے دلی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتائی گئی ہے۔ بلاک کی (۶) تصاویر، دو نقشے۔ قیمت صرف (۴؍)۔